Dr shyama parsad mukharjee university,Ranchi

B.A Sem-04

Sub-Urdu, HC-401

درج ذیل معروضی سوالات کا جواب دیجیے۔

(i) غزل کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) اردو

(ii) غزل کا پہلا شعر کیا کہلاتا ہے؟

(الف) مقطع (ب) مطلع (ج) حسن مطلع

(iii) غزل میں مطلع اور مقطع کے علاوہ باقی اشعار کیا کہلاتے ہیں؟

(الف) بیت (ب) فرد (ج) بیت الغزل

(iv) غالب کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) دلی (ب) لکھنؤ (ج) آگرہ

(v) لفظ 'مصرعہ' کے کیا معنی ہیں؟

(الف) دروازے کا ایک پٹ (ب) دروازے کا دو پٹ (ج) دونوں

(vi) مسجد قرطبہ کس کی نظم ہے؟

(الف) نظیر (ب) فیض (ج) اقبال

(vii) تنہائی کس کی نظم ہے؟

(الف) شہریار (ب) فیض (ج) اختر الایمان

(viii) نظیر اکبر آبادی کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) آگرہ (ب) دلی (ج) اورنگ آباد

(ix) اقبال کے کتنے شعری مجموعے ہیں؟

(الف) دو (ب) چار (ج) چھ

(x) یادیں کس کی نظم ہے؟

(الف) اختر الایمان (ب) فیض (ج) نظیر

subjective

(2) اقبال کی نظم نگاری پر ایک نوٹ سپرد قلم کریں۔

(3) اردو نظم نگاری سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔

(4) غزل کی فنی خصوصیات بیان کیجئے۔

(5) غالب کی حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

(6) نظم مسجد قرطبہ کی خصوصیات کو واضح کریں۔

(7) اختر الایمان کی نظم یادیں پر روشنی ڈالیے۔

(8) شہریار کی غزل گوئی پر ایک نوٹ لکھیے۔

(9) فانی بدایونی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔

B.A Semester IV

URDU- HC-401

Scanned with CamScanner

دیا۔ اکتوبر 1904ء تک ... اسلامیہ کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1911ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ... پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن نے کیا۔ جنوری 1923ء میں سر کا خطاب اورینٹل کالج کے ڈین مقرر ہوئے۔ 1920ء میں مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ... پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1930ء تک اس سے ملا۔ پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جون 1927ء میں ... 19 جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ مئی 1930ء میں وابستہ رہے۔ 1929ء میں 5 جنوری سے 8 جنوری تک ''خطبات مدراس'' دیے۔ ... فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ ''خطبات مدراس'' (انگریزی) شائع ہوئے۔ نومبر 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ ... بیت المقدس بھی گئے۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں وہاں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبال منتخب ہوئے۔ ... واپسی پر لاہور میں شاندار استقبال کیا گیا۔ 1934ء میں شرکت کی۔ دارالعلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال نے تقریر کی۔ ... پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ 1936ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب ... سالانہ جلسے میں نظم ''نغمۂ سرمدی'' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1929ء)، پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1933ء)، ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1936ء)، الٰہ آباد یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری برائے ڈی لٹ (1937ء) اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1938ء) میں عطا کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا؟

(ا) آر۔ اے۔ نکلسن (ب) آرنلڈ (ج) سر عبدالقادر (د) نذیر محمد بناری

2. اقبال کو کن کن یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کی ڈگریاں دی گئیں؟

23.4 نظم نگاری

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبال کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور ان کی شہرت بحیثیت نظم گو شاعر ہے۔ اقبال نے ہئیت کو کبھی اہمیت نہیں دی ان کی غزلوں میں تسلسل اور نظموں میں رنگِ تغزل ملتا ہے۔ اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بال جبریل کی شاعری میں مفکرانہ پہلو نمایاں ہیں۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت حاوی ہے۔ ''ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اس سے قبل انھوں نے ''فلاح قوم'' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں 1896ء) نالۂ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرھویں سالانہ جلسے میں 1900ء) اور ''در دِ دل یا یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' (انجمن حمایت اسلام کے سولھویں سالانہ جلسے میں 1901ء) پڑھی تھیں۔ ''ہمالہ'' نے صاحب ذوق حلقے کو چونکا دیا۔ اس نظم میں حسن فطرت، حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظر فطرت سے دلچسپی بعد کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبال نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظر قدرت کے مختلف نقشوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فطرت کا پیام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں ''گل رنگیں'' 'ابر کوہسار' 'آفتاب صبح' 'چاند' 'جگنو' 'شمع' 'ماہ نو' 'انسان اور بزم قدرت' 'ایک آرزو' 'موج دریا' 'ابر' 'کنارہ راوی' قابل ذکر ہیں۔ ''ایک آرزو'' شاعرانہ مصوری کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون زندگی کی خواہش کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی دامنِ کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے تصورات کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

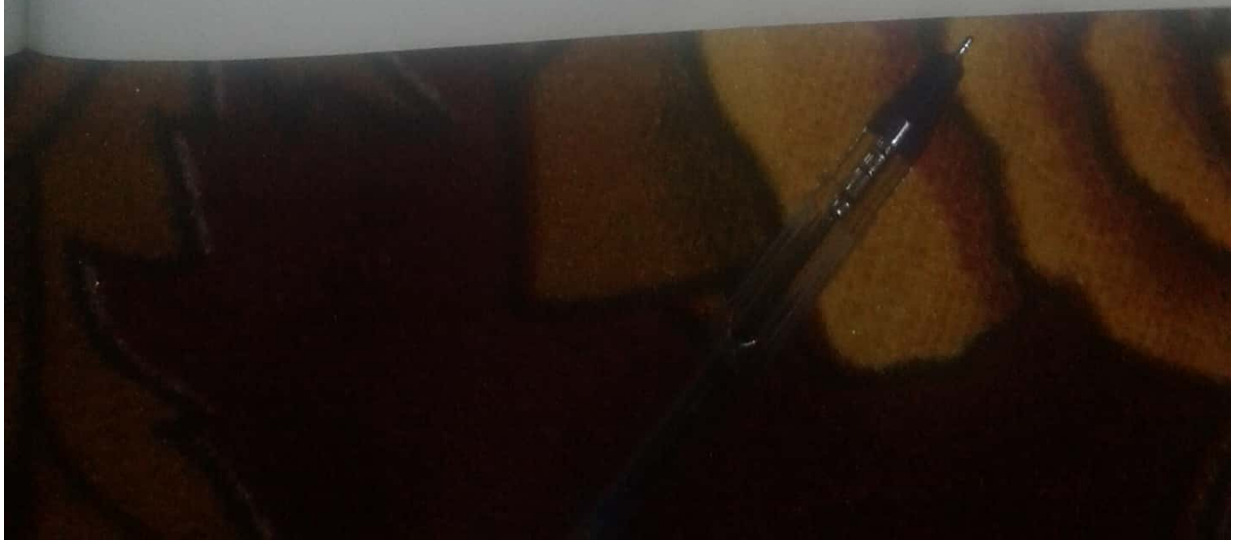

دیا۔ اکتوبر 1904ء میں [illegible] اردو [illegible] 1918ء [illegible] اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1911ء میں آل انڈیا مسلم لیگ [illegible] نکلسن نے کیا۔ جنوری 1923ء [illegible] اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ 1920ء میں مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ [illegible] کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1930ء تک اس سے وابستہ رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جولائی 1927ء میں پنجاب لیجسلیٹو [illegible]۔ 1929ء میں 5 جنوری سے 8 جنوری تک ''خطبات مدراس'' دیے۔ 19 جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ مئی 1930ء میں ''خطبات مدراس'' (انگریزی) شائع ہوئے۔ نومبر 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبال منتخب ہوئے۔ بیت المقدس بھی گئے۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دارالعلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال نے تقریر کی۔ واپسی پر لاہور میں شاندار استقبال کیا گیا۔ 1934ء میں انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ 1936ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'نفیر سرمدی' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1929ء) پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1933ء) ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1936ء) الہ آباد یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری برائے ڈی لٹ (1937ء) اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1938ء) میں عطا کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا؟

(ا) آر۔ اے۔ نکلسن (ب) آرنلڈ (ج) سر عبدالقادر (د) نذیر محمد بنارسی

2. اقبال کو کن کن یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کی ڈگریاں دی گئیں؟

23.4 نظم نگاری

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبال کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور ان کی شہرت بحیثیت نظم گو شاعر ہے۔ اقبال نے ہئیت کو کبھی اہمیت نہیں دی ان کی غزلوں میں تسلسل اور نظموں میں رنگ تغزل ملتا ہے۔ اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بال جبریل کی شاعری میں مفکرانہ پہلو نمایاں ہیں۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت حاوی ہے۔ ''ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اس سے قبل انھوں نے ''فلاح قوم'' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں 1896ء) نالہ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں 1900ء) اور ''دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'' (انجمن حمایت اسلام کے سولھویں سالانہ جلسے میں 1901ء) پڑھی تھیں۔ ''ہمالہ'' نے صاحب ذوق حلقے کو چونکا دیا۔ اس نظم میں حسن فطرت، حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے دلچسپی بعد کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبال نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظر قدرت کے مختلف مرقعوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فطرت کا پیام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں ''گل رنگیں'' ابر کوہسار' آفتاب صبح' چاند' جگنو' شمع' ماہ نو' انسان اور بزم قدرت' ایک آرزو' موج دریا' ابر' کنارہ' راوی قابل ذکر ہیں۔ ''ایک آرزو'' شاعرانہ مصوری کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پر سکون زندگی کی خواہش کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی دامنِ کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے تصورات کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

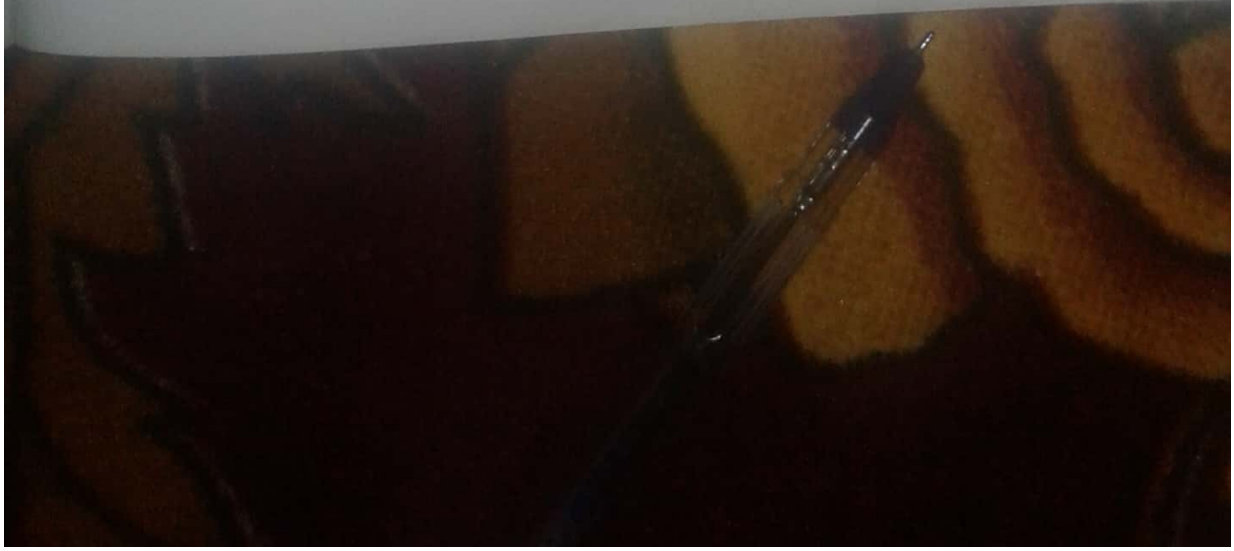

مسلمان کے سکریٹری بنائے گئے۔ 23 فروری ... انجمن حمایت اسلام کے ... کے موضوع پر ... کتاب ... کی گئی۔ 1910ء میں انجمن حمایت دیا۔ اکتوبر 1904ء میں پہلی اردو تصنیف ''علم الاقتصاد'' لاہور سے شائع ہوئی۔ ... معاشیات کے موضوع پر ... ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ دہلی کے تیسرے اجلاس کی صدارت کی۔ 1918ء میں اسلام کی جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ 1911ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل ... نکلسن نے کیا۔ جنوری 1923ء میں سر کا خطاب اورینٹل فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ 1920ء میں مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن ... پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور 1930ء تک اس سے ملا۔ پنجاب یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن مقرر ہوئے۔ جون 1927ء میں پنجاب ... 19 جنوری کو میر عثمان علی خاں سے ملاقات کی۔ 1930ء میں وابستہ رہے۔ 1929ء میں 5 جنوری سے 8 جنوری تک ''خطبات مدراس'' دیے۔ ... فلسطین میں اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ ''خطبات مدراس'' (انگریزی) شائع ہوئے۔ نومبر 1931ء میں لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ بیت المقدس بھی گئے۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں وہاں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ چار نائب صدور میں سے ایک اقبال منتخب ہوئے۔ ... شرکت کی۔ دارالعلوم کمیٹی روم میں ایک تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں اقبال نے تقریر کی۔ واپسی پر لاہور میں شاندار استقبال کیا گیا۔ 1934ء میں انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔ 1936ء میں محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں نظم 'نغمۂ سرمدی' پڑھی یہ آخری شرکت تھی۔ ڈاکٹر اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1929ء)، پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1933ء)، ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1936ء)، الٰہ آباد یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری برائے ڈی لٹ (1937ء) اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری (1938ء) میں عطا کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1 اقبال کی مثنوی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کس نے کیا؟

(ا) آر۔اے۔ نکلسن (ب) آرنلڈ (ج) سر عبدالقادر (د) نذیر محمد بنارسی

2 اقبال کو کن کن یونیورسٹیوں سے ڈی لٹ کی ڈگریاں دی گئیں؟

23.4 نظم نگاری

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبال کی نظموں کی تعداد غزلوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور ان کی شہرت بحیثیت نظم گو شاعر ہے۔ اقبال نے ہئیت کو کبھی اہمیت نہیں دی ان کی غزلوں میں تسلسل اور نظموں میں رنگ تغزل ملتا ہے۔ اقبال کے پہلے شعری مجموعے بانگ درا میں حسن فطرت سے دلچسپی اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بال جبریل کی شاعری میں مفکرانہ پہلو نمایاں ہیں۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کی نظموں پر ڈرامائی انداز اور خطابت حاوی ہے۔ ''ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ اس سے قبل انھوں نے ''فلاح قوم'' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں 1896ء) نالہ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں 1900ء) اور ''دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے'' (انجمن حمایت اسلام کے سولھویں سالانہ جلسے میں 1901ء) پڑھی تھیں۔ ''ہمالہ'' نے صاحب ذوق حلقے کو چونکا دیا۔ اس نظم میں حسن فطرت، حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ماضی کی بازیافت کا جذبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت سے دلچسپی بعد کی نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں اقبال نے نیچرل نظمیں لکھیں اور مناظر قدرت کے مختلف مرقعوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو فطرت کا پیام بھی دیا۔ ایسی نظموں میں ''گل رنگیں''، ''ابر کوہسار''، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع، ماہ نو، انسان اور بزم قدرت، ایک آرزو، موجِ دریا، ابر، کنارہ راوی قابل ذکر ہیں۔ ''ایک آرزو'' شاعرانہ مصوری کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک پرسکون زندگی کی خواہش کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی دامنِ کوہ میں چھوٹا سا جھونپڑا ہو جہاں وہ سب سے الگ تھلگ اپنے تصورات کی دنیا میں مست زندگی بسر کرے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

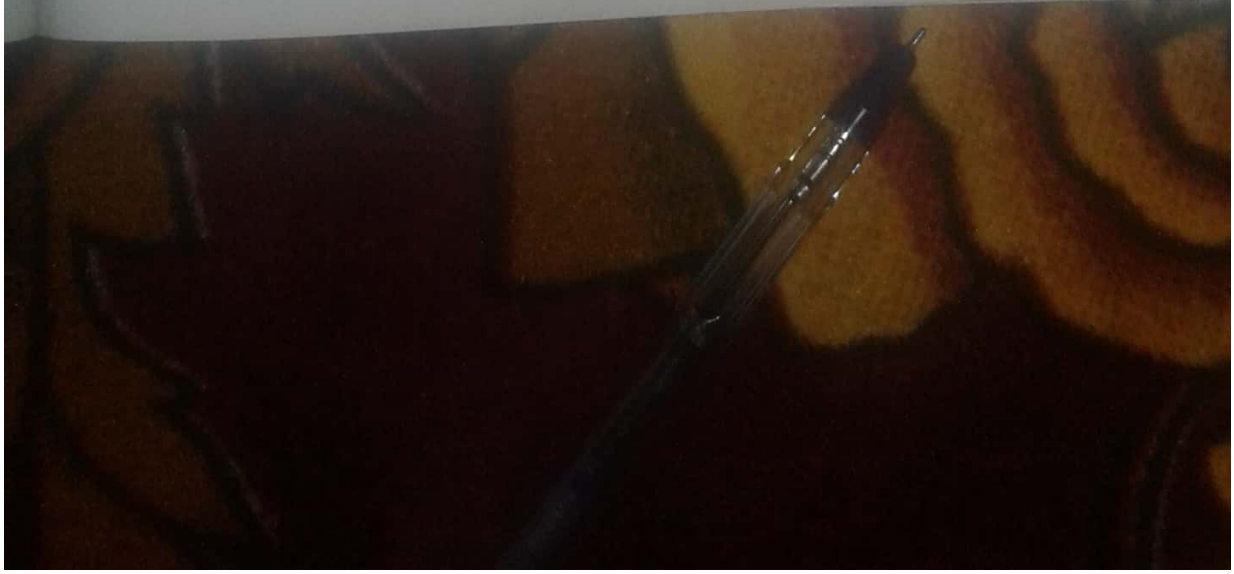

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

"پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو" ایک اچھوتا خیال اور ایک خوب صورت تجسیم ہے۔ بانگ درا کے حصہ دوم میں 'حقیقت حسن' 'کلی' 'چاند اور تارے' 'انسان' 'ایک شام' 'تنہائی' جیسی نظمیں فطرت کے جمال و پیام کے آئینے ہیں۔

اقبال نے تجریدی تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کیا اور غیر مرئی اشیا کی تجسیم کر کے خوبصورت پیکر بنائے۔ ان کے افکار اور تصورات استعاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی خوبصورت مثال "حقیقت حسن" ہے۔ حصہ سوم میں 'ستارہ' 'نمود صبح' 'بزم انجم' 'چاند' 'شبنم اور ستارے' 'آفتاب' 'پھول' جیسی نظمیں ہیں جس میں شاعری اور فلسفے کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اقبال حسن قدرت کے مظاہر میں معنویت تلاش کرتے ہیں اور فطرت کے ساتھ انسان کی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بے جان اشیا کو ذی روح محسوس کرتے ہیں اور ان کی زبانی اپنی بات کہتے ہیں۔ اقبال فلسفیانہ نظموں کے آغاز میں کچھ اس طرح منظر نگاری کرتے ہیں جس سے فضا سازی میں مدد ملتی ہے۔ گورستان شاہی میں وہ سوگوار فضا بناتے ہیں۔ "خضر راہ" کی ابتدا میں جو منظر کشی انھوں نے کی ہے وہ ایک خاص فضا کی تشکیل کرتی ہے۔ 'مسجد قرطبہ' کے آخر میں یہ منظر نگاری اس کی معنویت بڑھا دیتی ہے:

وادیٔ کہسار میں غرق شفق و سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دختر دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہد شباب

وطنی اور قومی شاعری میں انھوں نے حب الوطنی کے جذبات ابھارنے کی کوشش کی ہے یا قوم کو دعوت عمل دی ہے۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ترانۂ ملی' نیا شوالہ' وطنیت' خطاب بہ جوانان اسلام' ہلال عید' صدائے درد' تصویر درد' آفتاب' ترانۂ ہندی اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے قوم کو اتحاد کا پیغام دیا۔ اور خبردار کیا کہ اگر وہ متحد نہ رہیں گے تو پوری قوم کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اس زمانے میں اقبال نے بچوں کی نظمیں بھی کثرت سے لکھیں جن میں ایک مکڑی ایک مکھی' ایک پہاڑ اور گلہری' ایک گائے اور بکری' بچے کی دعا' ماں کا خواب' پرندے کی فریاد' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور ہمدردی اہم ہیں۔ ان میں بعض نظمیں مشہور شعرا ایمرسن' ولیم کوپر' لانگ فیلو اور ٹمنی سن کے خیالات سے متاثر ہو کر لکھیں۔

اخلاقی نظموں میں گل پژمردہ' زہد اور رندی' طفل شیر خوار' گورستان شاہی شبنم اور ستارے شامل ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے اخلاق حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا سبق آموز واقعات کو نظم کیا ہے۔

تاریخی نظموں میں ہلال' صقلیہ' غلام قادر رہیلہ' حضور رسالت مآب میں' فاطمہ بنت عبداللہ' محاصرہ ادرنہ' صدیق اکبر' بلاد اسلامیہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں یا مشاہیر اسلام کو موضوع بنایا ہے۔

اقبال کی ابتدائی نظموں میں تلاش' تحقیق اور تجسس کا رنگ گہرا ہے۔ اس دور میں اقبال نے حیات' ماخذ حیات' مقصد حیات' حیات بعد الموت' شعور ذات' خودی' بے خودی' حسن و عشق کے بارے میں غور و فکر کی۔ اس دور کی نظموں میں اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ گل رنگیں' خفتگان خاک سے استفسار' شمع' انسان اور بزم قدرت' بچہ اور شمع' جگنو اور دل ایسی ہی نظمیں ہیں۔

1905ء میں اقبال یورپ گئے تھے اور 1908 تک وہاں رہے۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ وہاں کی سیاست کو انھوں نے قریب سے دیکھا۔ انھیں وہاں کی تہذیب کی حقیقت کا پتہ چلا۔ انھیں احساس ہوا کہ قومیت اور وطنیت کا نظریہ انسانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس سے تعصب اور تنگ نظری کو تقویت ملتی ہے۔ اقبال نے دیکھا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے۔ وہ منکر خدا ہیں۔ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کی نجات اسلامی اصولوں کی تبلیغ و اشاعت میں مضمر ہے۔ 1908ء سے 1938ء تک اقبال کی نظموں میں ایک جداگانہ انقلابی رنگ حاوی ہے۔ ان کی اس تبدیلی کا مظہر ان کی نظم "طلبہ علی گڑھ کالج کے نام" ہے جو انھوں نے یورپ میں قیام کے دوران 1907ء میں لکھی۔ اقبال نے پہلی مرتبہ قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا اور اسی نظم سے ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی۔ 1857ء کی ناکام جدوجہد کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ مسلمانان ہند کا کوئی نصب العین نہیں تھا۔ اقبال نے انھیں عشق و عمل کا پیغام دیا۔ وہ کہتے ہیں

اوروں کا ہے پیام اور' میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

اس نظم میں اقبال کے ان تصورات کے ہلکے نقوش نظر آتے ہیں جو آگے چل کر ایک منضبط فلسفے کی صورت میں ابھرے ہے۔ اس نظم میں اقبال نے عقل اور عشق کا تقابل پیش کیا۔ اقبال نے عشق اختیار کرنے کی تلقین کی۔ انھوں نے قوم میں ولولہ اور جوش پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں۔ 1906ء میں انھوں نے نظم "محبت" لکھی جس میں انھوں نے حسن نیکی اور صداقت جیسے ستیم شیوم سندرم کے فلسفے کو پیش کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا۔ یورپ کے قیام کے دوران ان کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کا احساس نظم "عبد القادر کے نام" میں ملتا ہے۔ یہ نظم انھوں نے 1908ء میں اپنے دوست سر عبد القادر کے نام لکھی تھی۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال نے نظم "صقلیہ" لکھی۔ جزیرہ سسلی کو عربی میں صقلیہ کہتے ہیں۔ عربوں نے اس جزیرے کو تہذیب و تمدن اور علم و فضل اور صنعت و حرفت سے مالا مال کیا تھا۔ اقبال نے صقلیہ کو تہذیب حجازی کا مزار کہا۔ اس دور میں اقبال کی نظموں کا موضوع فلسفہ خودی، فلسفہ بے خودی اور عشق ہو گیا۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ قوت کو مسلمانوں کو جگانے اور ان کے دل میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے قوم کو امید و یقین کا پیغام دیا۔ اطاعت اسلام کے جذبے کو ابھارا، مغرب کی مادہ پرست تہذیب کے خطرات سے آگاہ کیا۔ خطاب بہ نوجوانان اسلام، مسلم، شعاع آفتاب، نوید صبح، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام ان خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ شکوہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جو انھوں نے 1911ء میں لکھی۔ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کے دور عظمت و شوکت کا حال اور موجودہ زبوں حالی کو نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔ اردو کا شعری سرمایہ اس انداز سے بالکل نا آشنا تھا۔ یہ اس دور کے مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ شکوہ بے حد مقبول ہوئی۔ شکوہ کے ڈیڑھ سال بعد اقبال نے "جواب شکوہ" لکھی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ یہ نظم بیانیہ انداز کی ہے۔ اس میں تاسف کا اظہار بھی ہے، امید بھی بندھائی گئی۔ دعوت عمل بھی ہے۔ ان سب نے مل کر نظم کو منفرد بنا دیا ہے۔ ڈرامائی رنگ نے اس کی تاثیر میں اضافہ کیا۔ کہیں کہیں طنزیہ انداز سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔ جیسے

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

"جواب شکوہ" فکر و خیال کی ندرت کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی ایک خوب صورت نظم ہے۔ تاثر کی شدت اور جذبے کی گہرائی نظم کے ہر حصے میں موجود ہے۔ نظم کا اختتام اس قدر لا جواب ہے کہ اس کی مثال پوری شاعری میں نہیں ملتی:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

سرکار دو عالمؐ سے اقبال کی بے پناہ محبت ان کی دوسری نظموں میں جھلکتی ہے۔ "شمع و شاعر" بھی ایک اہم نظم ہے۔ اقبال نے رمز، کنایہ و علامت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اقبال نے شاعری کی پرانی و روایتی علامتوں کو نئے معنی و مطالب عطا کیے۔ اس نظم کا موضوع قومی انحطاط، مسلمانوں کا مقام، راہِ عمل اور درخشاں مستقبل ہے۔ اقبال مسلمانوں کے انحطاط کا سبب ان کے انفرادی کردار کا خاتمہ، اخلاقی پستی، بے عملی، تن آسانی، موثر قیادت کا فقدان آپسی نفاق و انتشار بتاتے ہیں۔ اقبال مسلمانوں کو اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ وہ ماضی میں کیا تھے:

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاں دارا، جہاں بان و جہاں آرا

اقبال مسلمانوں کے روشن مستقبل کا انحصار مغرب کی تقلید سے احتراز بتاتے ہیں۔ دوسری طرف وہ مغربی سیاست کی عیاری سے بھی باخبر کرتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ، سرزمین عرب کی تقسیم، اسرائیل کا قیام یہ سب کچھ مغربی چالوں کے مظہر تھے۔ اس پس منظر میں اس نظم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اقبال کی ایک اور طویل نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فلسفہ حیات و ممات، جبر و قدر، عظمت انساں اور سوز و گداز کی اہمیت کو موضوع بنایا۔ "خضرِ راہ" اور "طلوع اسلام" میں اقبال نے مسلمانوں کو امید افزا مستقبل کا مژدہ سنایا۔

"بال جبریل" 1935ء میں شائع ہوئی۔ "بال جبریل" اقبال کی اردو شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ "بال جبریل" سرزمین قرطبہ کے متعلق نظموں

سے شروع ہوتا ہے'' ہسپانیہ' قید خانے میں معتمد کی فریاد' عبدالرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا درخت (سرزمین اندلس میں) طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں کے احساسات وسیع اور واضح ہو کر ایک بڑی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ پوری نظم شاعری کا کارنامہ ہے۔ وقت مسلسل متحرک ہے' عشق لافانی ہے۔ مسجد دین اور فن کی علامت ہے' مرد مومن ایک کائناتی قوت ہے۔ عصر حاضر ایک انقلابی موڑ پر ہے۔ خون جگر کے بغیر سارے نقش ناتمام ہیں۔ اقبال کے تصور عشق' فلسفۂ عمل اور مرد مومن پوری وضاحت کے ساتھ اس نظم میں موجود ہیں۔ اقبال کے مرد مومن میں علم و محبت' عقل و عشق میں ایک ہم آہنگی ہے جو اسے ایک عالمگیر علامت بناتی ہے۔ بال جبریل کی دوسری اہم نظمیں 'ذوق و شوق' اور 'ساقی نامہ' ہیں۔ اقبال نے جو بات 'شکوہ' میں اجتماعی طور پر کھلے انداز میں کہی وہی بات 'ذوق و شوق' میں انفرادی طور پر اختصار کے ساتھ اشاروں میں کی ہے۔ یہ علامتیہ انداز شاعر کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوز و گداز ہے۔ یہ نظم ایجاز و بلاغت کی عمدہ مثال ہے۔ ''ساقی نامہ'' بھی اقبال کی اہم نظم ہے اور یہ ایک پر جوش نظم سمجھی جاتی ہے۔ اس نظم میں اقبال کا فلسفہ ایک نغمے میں ڈھل گیا ہے اور پوری نظم مترنم اور رواں ہے۔

بال جبریل میں خوب صورت تمثیلی اور علامتی نظمیں ملتی ہیں۔ علامتی نظموں میں ''لالہ صحرا'' اور ''شاہین'' اہم ہیں۔ لالہ صحرا کائنات کی وسعتوں میں انسان کی تنہائی اور کارفرمائی کی علامت ہے۔ لالہ اور شاہین اقبال کی مرغوب علامتیں ہیں۔ شاہین ایک طاقت ور پرندہ ہی نہیں بلکہ اس میں فقر و غنا' غیرت وحمیت' سخت کوشی اور وسیع النظری' مردار چیزوں سے پرہیز' تازہ شکار کرنا ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اقبال نے شاہین کو علامت بنایا۔ اقبال افراد کی سیرت پر لالہ صحرا کی خاموشی و دل سوزی اور شاہین کی طرح لہو گرم رکھنا چاہتے ہیں تا کہ جلال و جمال' وقار اور عمل کے امتزاج سے ایک متوازن کردار کائنات میں ہستی کی داد دے۔

تمثیلی نظموں میں ''روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''۔ ''لینن خدا کے حضور میں''۔ ''فرشتوں کا گیت''۔ ''فرمانِ خدا''۔ ''جبریل و ابلیس کا مکالمہ'' قابل ذکر ہیں۔ لینن پر نظم اقبال کے فلسفۂ حیات' مطالعہ تاریخ اور تجزیہ سیاست کی ترجمان ہے۔ وہ سرمایہ داری اور مادہ پرستی کے ساتھ کلیسائیت پر بھی شدید تنقید کرتے ہیں کیوں کہ مغرب کی مسخ شدہ مسیحیت اور غلط مذہبیت کے ردعمل کے طور پر کمیونزم کی بنیاد دہریت اور الحاد پر رکھی گئی ہے۔

ضرب کلیم میں چھوٹی اور متوسط نظمیں ہیں۔ ''شعاعِ امید'' سب سے مشہور اور فکر و فن کے اعتبار سے ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر خطاب کا اثر دکھایا گیا۔ تیسرے حصے میں شعاعِ آفتاب کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک پورا مشرق اور سارا عالم روشن نہ ہو جائے۔ یہ 'شعاعِ امید' اقبال کی شاعری کے امید افزا پیام کی علامت ہے۔ ضرب کلیم کی دوسری نظموں میں علم و عشق' نگاہ' صبح چمن' لا الہ الا اللہ' معراج' مدنیت اسلام' نکتہ توحید' مرد مسلماں' سلطان ٹیپو کی وصیت' عورت' نگاہ شوق' فنون لطیفہ' ابی سینا' ابلیس کا فرمان اور مسولینی بھی اہم نظمیں ہیں:

''ارمغان حجاز'' کی سب سے اہم نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' ہے۔ اس میں پانچوں مشیر دنیا کی صورت حال سے ابلیس کو آگاہ کرتے ہیں۔ پانچواں مشیر اشتراکیت کے نئے فتنے کی نشان دہی کرتا ہے۔ ابلیس اپنے خطاب میں واضح کرتا ہے کہ ابلیسی نظام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں اسے سب سے زیادہ خطرہ امت مسلمہ سے ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ مو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں' اسلام ہے

ابلیس کی مجلس شوریٰ اپنی ڈرامائیت' روانی' رنگ و آہنگ کے اعتبار سے اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے:

نظم نگاری

سرسید کی تحریک کے زیر اثر مغرب کی تیز ہواؤں کا جو شور اٹھا، اسی میں نظم جدید کی داغ بیل پڑی۔ مغرب میں نظم کے لیے یہ طریقہ اپنایا جاتا تھا کہ کسی خیال کو شروع سے آخر تک ترتیب سے بیان کیا جائے جو غزل سے بالکل مختلف ہے۔ ''انجمن پنجاب'' کے جلسوں میں محمد حسین آزاد اور حالی اپنی ابتدائی نظمیں پیش کر رہے تھے۔ اس وقت تک علی گڑھ تحریک سے حالی کا تعلق بھی قائم نہیں ہوا تھا لیکن مغرب کے علمی خزینوں سے استفادہ کرنے کے تئیں سرسید کی صلاح اب عام طور پر لوگ ماننے لگے تھے۔ محمد حسین آزاد کو بھی ایک موقع ملا کہ انگریزوں کی مدد سے مغرب میں شعر و ادب کے حلقے میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ محکمۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب نے 1865 میں جس 'انجمن پنجاب' Useful knowledge کی توسیع کے لیے قائم کیا، اس میں محمد حسین آزاد کی نظامت کے دوران جان پڑ گئی۔ 1867 میں انھوں نے تعلیم اور شعر و ادب کے موضوعات پر 23 لکچر دیے۔ خاص طور سے 5 اگست 1867 اور 19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جو خطبات دیے، وہ اردو کی جدید نظم کی تاریخ میں آئین کے طور پر مسلّم ہیں۔ یہیں سے نظمِ جدید کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلسل چراغ سے چراغ جلتے گئے۔

یہ صحیح ہے کہ اردو کی نظمِ جدید مغرب کی نظموں کے زیرِ اثر ''انجمنِ پنجاب'' کی نشستوں میں سامنے آئی لیکن اردو میں موجود ماقبل سرمائے کا جائزہ لینے پر پتا چلتا ہے کہ جیسی نظمیں حالی اور آزاد نے پیش کیں، ویسی تخلیقات اردو میں پہلے سے موجود تھیں جنھیں نظم کی تاریخ کا حصہ نہیں ماننا کوتاہ نظری اور بے انصافی ہے۔ دکن میں قلی قطب شاہ نے جو موضوعاتی نظمیں کہیں، انھیں آخر نظم کی تاریخ سے کیوں ہٹایا جائے۔ خاص طور سے اپنی محبوباؤں کی تعریف میں بادشاہ نے جو مختصر نظمیں کہیں، وہ صدفی صد نظمِ جدید کے دائرۂ کار میں شامل ہونے کا جواز رکھتی ہیں۔ ابتدائی شعرا میں دکن میں ولی اور دہلی میں فائز دہلوی کے ہاں اچھی خاصی تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ فائز کے دیوان میں میلا، پنگھٹ اور تہواروں کے ساتھ قدرتی مناظر پر جو نظمیں موجود ہیں، انھیں اردو نظم کی تاریخ میں اَلقط نہیں کیا جا سکتا۔ فائز نے مغرب کے مقامیت والے رجحان کو بھی از خود اپنی نظموں میں آزمالیا تھا۔

اردو کی جدید نظم یا قدیم نظم اپنے عظیم ہنرمند شاعر نظیر اکبر آبادی کے کمالات سے استفادہ کیے بغیر اپنے معیار کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتی تھی۔ نظیر اکبر آبادی اردو کی ادبی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہیں اور یہ فضیلت انھیں غزل گوئی کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ اُن کا اصل کارنامہ نظم نگاری سے متعلق ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے واقعتاً نظم کے موضوعاتی اور ہیئتی امکانات تلاش کیے۔ اس حقیقت کا اعتراف تکلیف دہ ہے لیکن یہ سچائی ہے کہ مغرب اور مشرق دونوں کے علمی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے

Scanned with CamScanner

باوجود اردو میں یہ شمول حالی اور آزاد کوئی دوسرا ایسا نظم نگار سامنے نہیں آیا جس کے پاس کائنات اور زندگی کا اتنا گہرا اور وسیع تناظر موجود ہو۔ عوامی رجحان اور تہذیب و ثقافت کی نیرنگیوں کو اپنی نظم گوئی کا حصہ بنا کر نظیر نے جو کارنامہ انجام دیا اس کی کوئی دوسری مثال اردو میں نہیں ملتی۔

19 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے جدید شاعری کے موضوع پر لکچر دیا، اسی کے ساتھ اپنی ایک نظم 'شب قدر' بھی پیش کی۔ عام طور پر اسی تخلیق کو اردو کی پہلی جدید نظم قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس انداز کی موضوعاتی نظمیں اسماعیل میرٹھی اور حالی نے لکھی تھیں لیکن وہ تمام انگریزی نظموں کا ترجمہ تھیں۔ آزاد نے اپنی نظم سنانے کے بعد آئندہ ماہ کی نشست کے لیے 'برسات' موضوع سے نظمیں لکھنے کی دعوت دی۔ 30 مئی کے مشاعرے میں حالی کی 'برکھارت' اور آزاد کی نظم 'ابر کرم' سامنے آئیں۔ آئندہ مشاعروں میں حالی، محمد حسین آزاد اور اسماعیل میرٹھی نے لگاتار نظمیں پیش کیں۔ محمد حسین آزاد کے تو سبھی نو مشاعروں میں اپنی نظمیں سنائیں۔ اسی سے ان کے دیگر ہم عصروں میں نظم گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر اور اکبر الہ آبادی نے اس صنف میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے نظم گوئی کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

بیسویں صدی میں اقبال، چکبست اور نظم طباطبائی نے نظم گوئی کی طرف پوری توجہ کی۔ نظم گوئی میں ہیئت کے سب سے زیادہ تجربے طباطبائی نے کیے۔ Sonnet اور نظم معریٰ کی طرف انھوں نے خصوصی توجہ کی۔ چکبست نے مسدس کا بہترین استعمال کر کے اردو کی قومی شاعری میں اپنی جگہ قائم کی۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد اقبال اردو نظم کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اقبال نے بھی ہیئت اور موضوع دونوں کی سطح پر بہت واضح تبدیلیاں کیں۔ اقبال ہی نے یہ بتایا کہ نظموں میں فکر و فلسفہ کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔ اقبال کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا کہ نظموں کو عالمانہ موضوعات کی ترسیل کے لیے بھی آزمانے کا ایک سلسلہ قائم ہوا۔ مسدس، مثنوی کے ساتھ ساتھ ترکیب بند اور ترجیع بند اقبال کی مرغوب ہیئتیں ہیں۔ اقبال کی نظم گوئی کے بعد ایک نئی نظم کا سلسلہ قائم ہو رہا تھا۔

اقبال کے زمانے میں ہی جوش ملیح آبادی نے قومی تحریک سے ترغیب پا کر ملک کے سماجی اور سیاسی مسئلوں پر نظم گوئی کی ابتدا کر دی تھی۔ اپنے مخصوص انداز اور انقلابی لہجے نے جوش کو مقبولیت عطا کی۔ جوش کے ہم عصروں میں فراق نے مختصر تعداد میں نظمیں کہیں لیکن اُن کی امیجری Imagery اور انگریزی نظموں کے فنی لوازمات کی وجہ سے فراق اپنی بہترین غزل گوئی کے باوجود نظم کے بھی اہم شاعر ہیں۔ اُن کی طویل نظمیں ــــ 'آدھی رات'، 'جگنو' اور 'ہنڈولہ' اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ اُسی زمانے میں اختر شیرانی نے رومانی نظم گوئی کی طرف توجہ کی۔ غزل زدہ ماحول میں اختر شیرانی ایسے پہلے شاعروں میں ہیں جنھوں نے نظم پر خود کو مرتکز رکھا۔ انھیں شاعرِ رومان کہا گیا۔ مغربی نظم کی مختلف ہیئتوں کو اردو میں متواتر استعمال کر کے اختر شیرانی نے نظم گوئی کا ایک نیا باب قائم کیا۔ خاص طور پر سانٹ کے بہترین نمونے اختر شیرانی کے یہاں ملتے ہیں۔ انگریزی میں رومانیت کے حوالے سے یادِ ماضی، سوز و غم، زندگی سے فرار اور احساسِ جمال کے ملے جلے موضوعات اہم رہے ہیں جنھیں اختر شیرانی کی نظموں میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے بزرگ ہم عصروں میں عظیم الدین احمد نے بھی صنفِ نظم کے تعلق سے اچھے خاصے تجربے کیے اور سلسلۂ خیال اور

Scanned with CamScanner

موضوعاتی ارتکاز کو دھیان میں رکھتے ہوئے لکھیں گئیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "کل نغمہ" کلیم الدین احمد کے پیش لفظ کی وجہ سے زیر بحث رہا لیکن بدقسمتی سے ان کی نظمیں زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں۔ اقبال اور ترقی پسند شاعری کے درمیان مذکورہ چار شعرا ایک پل کا کام کر رہے ہیں۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ جہاں شعر و ادب کی بنیادی زمین میں واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں، وہیں اردو نظم نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ ترقی پسندوں کے مجموعی سرمائے کا محاسبہ کیا جائے تو یہ کہنا صد فی صد صحیح ہوگا کہ اردو نظم ایک نئے معاشرے میں چلی آئی۔ حالی سے لے کر اقبال تک نظم گوئی کا جو سلسلہ تھا، وہ ترقی پسند شعرا کے یہاں بدل گیا۔ اسی زمانے میں آزاد نظم اور نظم معریٰ کی سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ نظمیں مقبول بھی ہونے لگیں۔ ترقی پسندی کے آغاز کے دور میں جذباتیت کی وجہ سے جب کسی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ غزل جاگیردارانہ معاشرے کی پروردہ ہے تو غزل گو شعرا ایک سلسلے سے نظمیں کہنے لگے۔ کئی شاعروں نے اپنی غزلوں پر بے وجہ عنوان لگا کر انھیں نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی۔ فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، مجاز، علی سردار جعفری، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، یگانہ اعظمی، وامق جونپوری، سکندر علی وجد ایسے شعرا ہیں جنھوں نے ترقی پسند نظم گوئی کو بلندی عطا کی۔ انھی شعرا کی کوششوں سے اردو کی ادبی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا جب غزل گوئی کے مقابلے میں نظم نگاری زیادہ آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی۔

حلقۂ ارباب ذوق نے ملک گیر سطح پر کوئی واضح سرگرمی نہیں دکھائی لیکن چند شعرا نے اردو میں نظم کے نئے تصور کو قائم کرنے میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ ابتدائی زمانے میں چلنے والے لوگوں نے ایک ایسی نظم کا خاکا اپنے سامنے رکھا جس میں زندگی کے انفرادی معاملات بھی توجہ کے ساتھ شامل کیے جا سکیں۔ یہ کہنا غیر مناسب ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کا سماجی نقطۂ نظر محدود یا غیر سماجی تھا۔ اُس زمانے میں 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' کا غیر ضروری تنازعہ بھی زوروں پر تھا۔ اس لیے سہل پسندی میں لوگوں نے یہ مفروضہ بنا لیا کہ ترقی پسند 'ادب برائے زندگی' کے علم بردار ہیں اور حلقۂ ارباب ذوق کے لوگ 'ادب برائے ادب' کے قائل ہیں۔ کم سے کم اختر الایمان کی شاعری یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ غمِ ذات سے غمِ کائنات تک کا سفر کتنی سرعت کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے اہم شعرا میں ن۔م۔ راشد، میراجی، قیوم نظر اور مجید امجد کی شاعری اردو نظم کے بہترین دور سے عبارت ہے۔ خاص طور پر راشد، میراجی اور اختر الایمان جدید اردو نظم کے ایسے مثلث ہیں جن کے شاعرانہ کمالات پر غور کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ ان شعرا نے ہیئت کے اچھے خاصے تجربے کیے۔ حالاں کہ آزاد اور معریٰ نظم میں ان کے تجربے زیادہ کامیاب ہوئے۔ موضوع کو وسیع تناظر میں دیکھنا اور انسان کو اس کے اکیلے پن میں پہچاننا، دونوں پہلوؤں کو ان شعرا نے اپنی نگاہ میں رکھا۔ کہنے کو ترقی پسندوں کے ردِ عمل میں حلقۂ ارباب ذوق قائم ہوا لیکن نظم کے ارتقا کو پیمانہ بنائیں تو نئی نظم کا یہ زمانہ عہد زریں ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے 'سوغات' کا جدید نظم نمبر شائع کیا جسے اب بھی اردو نظم گوئی کا سب سے جامع انتخاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ انتخاب اردو نظم کے بہترین دور کی یادگار ہے۔

Scanned with CamScanner

اکائی: 1 غزل کی صنف اور اس کی فنی خصوصیات

ساخت

1.1 تمہید

1.2 غزل کی صنف اور ہیئت

1.3 غزل کی فنی خصوصیات

1.3.1 حذف و ایجاز اور ایمائیت

1.3.2 مجاز

1.3.3 تشبیہ

1.3.4 استعارہ

1.3.5 مجاز مرسل

1.3.6 کنایہ

1.4 صنعت نگاری

1.5 غزل کے موضوعات

1.6 خلاصہ

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.8 فرہنگ

1.9 سفارش کردہ کتابیں

1.1 تمہید

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف ہے۔ اردو شاعری میں کئی اصناف پروان چڑھیں اور ختم ہو گئیں جیسے مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ۔ اردو میں نظم نگاری کا آغاز ہوا تو کچھ عرصے کے لیے غزل پیچھے پڑ گئی لیکن ختم نہیں ہوئی، پھر غزل کا احیا ہوا تو وہ دیگر تمام اصناف پر سبقت لے گئی۔ گذشتہ برسوں میں اردو شاعری میں کئی نئی اصناف کا اضافہ ہوا لیکن کوئی بھی صنف غزل کی جگہ نہ لے سکی۔

اس اکائی میں غزل کے مفہوم اور ہیئت کی وضاحت کی جائے گی۔ غزل کا خاص وصف ایمائیت ہے۔ یہ دکھایا جائے گا کہ غزل میں ایمائیت پیدا کرنے کے کیا ذرائع ہیں۔ اس سلسلے میں غزل کی فنی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مجاز اور اس کی اقسام سے بحث کی گئی ہے اور آخر میں دکھایا گیا ہے کہ غزل میں صنائع لفظی اور صنائع معنوی کیا رول ادا کرتے ہیں؟

1.2 غزل کی صنف اور ہیئت

عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں بات کرنے کو غزل کہتے ہیں گویا اس کا دائرہ کار حسن پرستی اور عشق مجاز ہے۔ شمس قیس رازی نے غزل کی الگ توجیہ کی ہے۔ ہرن کو غزال کہتے ہیں اور غزال کی ایک خاص آواز کو غزل الکلب کہا جاتا ہے۔ جب ہرن کو شکاری کتے گھیر لیتے ہیں تو وہ سہم جاتا ہے

Scanned with CamScanner

عربی میں قصیدے کی تمہید کا تشبیب اور جس تمہید میں محبوب کا سراپا بیان کیا جائے اسے غزل کہتے ہیں۔ قصیدے کی صنف عربی سے فارسی میں آئی۔ فارسی کے شاعروں نے غزل کو قصیدے سے علاحدہ کر کے ایک مستقل صنف بنا دیا۔ قصیدے کی طرح غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں مطلع کہلاتا ہے۔ غزل کے باقی اشعار کے ہر دوسرے مصرع میں قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور ہم قافیہ الفاظ لائے جاتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔ غزل میں کم سے کم سات اور زیادہ سے زیادہ اکیس شعر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی گنتی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ غزل میں قافیہ لانا تو لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ردیف کا اضافہ کیا گیا۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو قافیے کے بعد لاتے ہیں اور ہر شعر میں ان کی تکرار ہوتی ہے۔ غالب کی غزل کے اشعار سے اس سانچے کی وضاحت ہوگی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس غزل میں پہلا شعر مطلع ہے۔ 'ہوا' 'دوا' 'جرا' 'مدعا' 'خدا' 'برا' قافیے ہیں۔ 'کیا ہے' ردیف ہے۔ آخری شعر مقطع ہے۔ جس میں 'غالب' تخلص آیا ہے۔ قافیے اور ردیف کی وجہ سے آوازوں کی تکرار ہوتی ہے اور غزل میں نغمگی پیدا ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. غزل کے لغوی معنی کیا ہیں؟
2. قافیے اور ردیف کی وضاحت کیجیے۔

1.3 غزل کی فنی خصوصیات

1.3.1 حذف و ایما اور ایمائیت

غزل کا ہر شعر معنوں کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے شعر یا اشعار سے معنوی ربط ہونا ضروری نہیں۔ اگر تمام اشعار میں خیال کا تسلسل ہو تو ایسی غزل کو غزل مسلسل کہیں گے۔ غزل کے ایک شعر یعنی دو مصرعوں میں کسی وسیع مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے جو آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے شاعر مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کے کسی حصے کو حذف کر دیا جائے۔ اور اس طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مومن کا شعر ہے:

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اس شعر میں یہ بات محذوف ہے کہ عاشق نے محبوب کو کیا الزام دیا۔ عذرِ امتحانِ جذبِ دل سے اشارہ ملتا ہے کہ الزام کیا تھا۔ محبوب نے عاشق سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ عاشق اس پر وعدہ خلافی کا الزام لگاتا ہے۔ محبوب نے جواب دیا کہ میں تمھارے جذبِ دل کا امتحان لے رہا تھا اگر تمھارے دل میں کشش ہوتی تو خود کھنچ کر چلا آتا۔ عاشق محبوب کو الزام دے رہا تھا لیکن محبوب کے جواب سے خود اس کا قصور نکل آیا۔

بیان کے جس حصے کو حذف کیا گیا اس کو پانے کے لیے غزلیہ شاعری کے مضامین سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات شاعر کے کلام سے رجوع ہو کر اس کے مخصوص مضامین شعری کا پتہ لگانا ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

Scanned with CamScanner

اور اس کے حلق سے درد بھری آواز نکلتی ہے۔ شکاری کتے اس آواز سے متاثر ہو کر اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آواز میں مایوسی کے ساتھ امید کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس تعریف کی رو سے غزل محرمات سے نکل کر زندگی کی کشمکش، انسان کی کاوشوں اور امید و بیم کی حالت کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔

عربی میں قصیدے کی تمہید کو تشبیب اور نسیب اور جس تمہید میں محبوب کا سراپا بیان کیا جائے اسے غزل کہتے ہیں۔ قصیدے کی صنف عربی سے فارسی میں آئی۔ فارسی کو شاعروں نے غزل کو قصیدے سے علاحدہ کر کے ایک مستقل صنف بنا دیا۔ قصیدے کی طرح غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں مطلع کہلاتا ہے۔ غزل کے باقی اشعار کے ہر دوسرے مصرع میں قافیے کی پابندی کی جاتی ہے اور ہم قافیہ الفاظ لائے جاتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے۔ غزل میں کم سے کم سات اور زیادہ سے زیادہ اکیس شعر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی۔ غزل میں قافیہ لانا تو لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ردیف کا اضافہ کیا گیا۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو قافیے کے بعد لاتے ہیں اور ہر شعر میں ان کی تکرار ہوتی ہے۔ غالب کی غزل کے اشعار سے اس سانچے کی وضاحت ہوگی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس غزل میں پہلا شعر مطلع ہے۔ ہوا' نا' دوا' جرا' مدعا' خدا' برا قافیے ہیں۔ 'کیا ہے' ردیف ہے۔ آخری شعر مقطع ہے۔ جس میں 'غالب' تخلص آیا ہے۔ قافیے اور ردیف کی وجہ سے آوازوں کی تکرار ہوتی ہے اور غزل میں نغمگی پیدا ہوتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1 غزل کے لغوی معنی کیا ہیں؟
2 قافیے اور ردیف کی وضاحت کیجیے۔

1.3 غزل کی فنی خصوصیات

1.3.1 حذف وایما اور ایمائیت

غزل کا ہر شعر معنوں کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے شعر یا اشعار سے معنوی ربط ہونا ضروری نہیں۔ اگر تمام اشعار میں خیال کا تسلسل ہو تو ایسی غزل کو غزل مسلسل کہیں گے۔ غزل کے ایک شعر یعنی دو مصرعوں میں کسی وسیع مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے جو آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے شاعر مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ بات کے کسی حصے کو حذف کر دیا جائے۔ اور اس طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مومن کا شعر ہے:

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اس شعر میں یہ بات محذوف ہے کہ عاشق نے محبوب کو کیا الزام دیا۔ عذرِ امتحانِ جذبِ دل سے اشارہ ملتا ہے کہ الزام کیا تھا۔ محبوب نے عاشق سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ عاشق اس پر وعدہ خلافی کا الزام لگاتا ہے۔ محبوب نے جواب دیا کہ میں تمھارے جذبِ دل کا امتحان لے رہا تھا۔ اگر تمھارے دل میں کشش ہوتی تو خود کھنچ کر چلا آتا۔ عاشق محبوب کو الزام دے رہا تھا لیکن محبوب کے جواب سے خود اس کا قصور نکل آیا۔

بیان کے جس حصے کو حذف کیا گیا اس کو پانے کے لیے غزلیہ شاعری کے مضامین سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات شاعر کے کلام سے رجوع ہو کر اس کے مخصوص مضامینِ شعری کا پتہ لگانا ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم   میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

غالب کا ایک اور شعر ہے:

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے   ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

دوسرے شعر کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات کھلتی ہے کہ نامہ بر خط لے کر محبوب کے پاس جاتا ہے تو محبوب کے حسن سے متاثر ہو کر اس کا عاشق ہو جاتا ہے۔ اب نامے کا جواب لانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ عاشق کئی بار اس تجربے سے گزرتا ہے۔ وہ اپنے دوست سے اس صورت حال کا ذکر کرتا ہے۔ دوست ایک شخص کو لاتا ہے اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ نامہ بری کا فرض انجام دے گا۔ نامہ بر بھی وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کو شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ نامہ بر خط لے کر جاتا ہے اور وہی ہوتا ہے جو ہوتا آیا تھا۔ نامہ بر رقیب بن جاتا ہے اور لوٹ کر نہیں آتا۔ اس پر دوست کو پشیمانی ہوتی ہے۔ عاشق اپنے دوست سے کہتا ہے کہ مجھے تجھ سے کچھ کلام نہیں' کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ میرا محبوب اتنا حسین ہے کہ جو بھی اسے دیکھے گا اس پر عاشق ہو جائے گا۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ لیکن نامہ بر جس کو اپنے پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ ثابت قدم رہے گا اور صرف نامہ بری سے سروکار رکھے گا' اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا۔ عاشق اپنے دوست سے کہتا ہے کہ اگر نامہ بر ملے تو میرا سلام کہنا۔ اردو میں سلام کہنے کے کئی مفہوم ہیں' کسی کو بلانا ہو تو کہتے ہیں کہ انھیں سلام کہیے' کسی کو یاد دلانا ہو تو بھی سلام کہلاتے ہیں' اور اگر کوئی اپنی بات پر قائم نہ رہے تو طنزیہ اسے سلام کہلاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی طنزیہ سلام کہلایا گیا ہے کہ تم تو بڑی باتیں کرتے تھے لیکن محبوب کو دیکھنے کے بعد خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ آپ نے دیکھا کہ حذف و ایما کے طریقے کو کام میں لا کر کس طرح ایک وسیع مضمون کو دو مصرعوں میں سمو دیا گیا ہے۔

شعر میں ایمائیت پیدا کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ بعض دفعہ شعر کی ایمائیت غیر متعین ہوتی ہے۔ یہ بات قاری پر چھوڑ دی جاتی ہے کہ وہ اپنے تجربے' مشاہدے اور تخیل کو کام میں لا کر کوئی مفہوم پیدا کرے۔ انوار انجم کا شعر ہے:

تم جو باتیں بھول چکے ہو مدت سے   میں تو اب بھی ان میں الجھا رہتا ہوں

محبوب سے ابتدائے عشق میں جو باتیں ہوتی رہیں جو وعدے ہوئے انھیں محبوب تو بھول گیا ہے لیکن عاشق اب بھی انھیں باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ وہ کیا باتیں تھیں شاعر نے واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ اپنے قیاس کو کام میں لائے اور شعر میں مفہوم پیدا کرے۔

تسلیم کا شعر ہے:

کیا کہہ عندلیب چمن سے نکل گئی   کیا سن لیا گلوں نے کہ رنگت بدل گئی

یہ بات واضح نہیں ہے کہ عندلیب نے کیا کہا اور گلوں نے کیا سن لیا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ عندلیب نے خزاں کی آمد کی خبر دی جس سے گھبرا کر پھولوں کا رنگ اڑ گیا۔ اس شعر کے اور بھی مفاہیم ہو سکتے ہیں۔

غزل کے شعر میں دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غزل میں بالعموم کوئی بات براہ راست نہیں بیان کی جاتی' اظہار کا بالواسطہ پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ کام مجاز اور صنائع و بدائع سے لیا جاتا ہے۔

1.3.2 مجاز

پہلے ہم مجاز کی تشریح کریں گے اور بتائیں گے کہ ان سے شعر میں ایجاز کے علاوہ اور کیا فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ اگر کلام میں لفظ کو لغوی معنی میں برتا جائے تو اسے حقیقت یا حقیقی معنی کہیں گے۔ اس کے برخلاف لفظ سے ایسے معنی مراد لیں جو اس کے حقیقی معنی نہ ہوں تو اسے مجاز کہیں گے۔

مجاز کی چار قسمیں ہیں (1) تشبیہ (2) استعارہ (3) مجاز مرسل (4) کنایہ

1.3.3 تشبیہ

تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہت دی جاتی ہے۔ جیسے:

Scanned with CamScanner

غالب

جس زمانے میں مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور مشرقی تہذیب کا آفتاب غروب ہونے کو تھا اس وقت شعر و ادب کی دنیا میں چند ایسی شمعیں ۱۷۹۶ء-۱۸۶۹ء روشن ہوئیں جنھوں نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب اس عہد کے سب سے نامور شاعر ہیں۔ ان کے دم سے اردو شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے قول کے مطابق "غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالب نے اسے ذہن دیا۔" انھوں نے غزل میں نئے موضوعات اور نئے مضامین داخل کر کے اس کا دامن وسیع کر دیا۔

اردو ادب میں غالب کو بہت بلند رتبہ حاصل ہے۔ وہ ہماری زبان کے بہت بڑے نثر نگار بھی ہیں اور بہت بڑے شاعر بھی۔ یہاں ہمیں ان کا مطالعہ ایک شاعر کی حیثیت سے کرنا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ پہلے وہ اسد تخلص کرتے تھے لیکن جب ایک اور شاعر اسد کا یہ شعر سنا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی ۔۔۔ مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

تو اسد تخلص ترک کر کے غالب تخلص اختیار کیا۔

غالب کا نام اسد اللہ خاں اور عرفیت مرزا نوشہ تھی مغل بادشاہ کی طرف سے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ ۱۷۹۶ء میں آگرے میں مرزا کی ولادت ہوئی۔ ان کا سلسلۂ نسب افراسیاب بادشاہِ توران تک پہنچتا ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے دہلی پہنچے۔ یہاں انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا گیا اور پھاسو کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا جو آگے چل کر ہاتھ سے نکل گیا۔

ان کے والد عبد اللہ بیگ ملازمت کے سلسلے میں مختلف مقامات پر رہے۔ آخر کار راجہ بختاور سنگھ کے ملازم ہوئے۔ ۱۸۰۱ء میں کسی لڑائی میں مارے گئے اور چچا نے پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ اکبر آباد کے صوبیدار تھے۔ مرزا صرف نو برس کے تھے کہ چچا کا انتقال

ہوگیا۔ سرکار انگریزی کی طرف سے مرحوم کے وارثوں کی پنشن مقرر ہوگئی جس میں سے سات سو روپے سالانہ مرزا کو بھی ملتا تھا۔ کچھ دنوں بہادر شاہ کے کلام پر بھی اصلاح دی۔ پچاس روپے ماہانہ یہاں سے بھی مقرر تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو انگریزی سلطنت نے مرزا کو باغیوں میں شمار کر کے پنشن بند کر دی۔ مغل سلطنت کا تو خاتمہ ہو ہی چکا تھا۔ مرزا کی گزر مشکل ہوگئی۔ سو روپے مہینہ نواب رامپور کی سرکار سے ملتا تھا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد غالب اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے اور انگریزی سرکار سے پنشن بحال ہوگئی۔ غالب کو اپنے حسب نسب اور اپنے شاعرانہ رتبے دونوں پر ناز تھا۔ وہ شاہانہ زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ اس وقت تہتر برس کے تھے۔

غالب نے شعر کہنا تو اسی وقت شروع کر دیا تھا جب وہ آگرے میں تھے لیکن اس وقت تک ان کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ تھا۔ دہلی آنے پر بھی یہی انداز رہا۔ لوگوں کو غالب کی اس روش پر بہت شکایت تھی۔ آخر کار خود غالب کو اس کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنا رنگ سخن بدلنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ مشکل گوئی رفتہ رفتہ ان کے کلام سے دور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سادہ و سہل زبان میں شعر کہنے لگے۔

غالب کے شعر صرف اسی لیے مشکل نہیں ہوتے کہ ان میں فارسی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ اس کا ایک سبب اور بھی ہے۔ ان کا تخیل بہت بلند ہے۔ خیال کی پرواز کبھی اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ شعر پہیلی بن جاتا ہے۔ اس لیے بعض شعر تو لوگوں کی سمجھ میں اس وقت آئے جب شاعر نے خود ان کا مطلب بیان کیا۔

تہ داری بھی غالب کے کلام کی ایک اہم صفت ہے۔ یعنی پہلی نظر میں شعر کا ایک مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ غور کیجیے تو اس کی تہ سے دوسرے معنی نکلتے ہیں۔ اس تہ داری نے بھی ان کے کلام کو مشکل بنایا۔ گویا تین چیزیں ہیں جن کے سبب غالب کا کلام کبھی کبھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہو جاتا ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا یہ ہیں: (۱) فارسیت کا غلبہ یعنی مشکل فارسی الفاظ کا استعمال

(۲) تخیل کی بلند پروازی اور (۳) تہ داری۔

غالب کی اس مشکل گوئی کی لوگوں کو شکایت ہوئی اور کہا گیا کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے

غالب ان اعتراضات پر جھنجھلاتے تھے۔ ایک بار غصے میں یہاں تک کہہ دیا ؎

مشکل ہے زبس کہ کلام میرا، اے دل — سن سن کے جسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

جب غالب کے شعروں کو مہمل کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا ؎

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن یہ ردِ عمل وقتی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سہل گوئی کی طرف آئے یہاں تک کہ انھوں نے اپنے کلام کا ایک انتخاب تیار کیا اور باقی کو منسوخ کر دیا لیکن یہ منسوخ کلام ضائع ہونے سے بچ گیا اور آج بھی موجود ہے۔

غالب کسی کے نقشِ قدم پر چلنا گوارا نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنا راستہ آپ نکالا اور سب سے الگ نکالا۔ ایک فارسی شعر میں انھوں نے کہا ہے کہ دوسروں کے پیچھے چلنے سے آدمی اپنی منزل کھو دیتا ہے۔ اس لیے جس راستے سے کارواں گزرا ہے۔ میں اس راستے پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ اپنا راستہ الگ نکالنے کی خواہش نے بھی غالب کے کلام کو پیچیدہ بنایا۔

شوخی و ظرافت بھی غالب کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ وہ ایک ہنس مکھ انسان تھے اور اپنی دلچسپ باتوں سے دوسروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کیجیے، ان کے خطوط پڑھیے یا ان کے دیوان کی ورق گردانی کیجیے، انکی پر لطف باتیں، ان کے دلچسپ لطیفے، چٹکلے قدم قدم پر آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے۔ وہ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ زاہد کو بخشتے ہیں، نہ جنت، دوزخ اور

فرشتوں کو چھوڑتے ہیں، نہ محبوب کو معاف کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ خود اپنا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتے۔ دیکھیے ؎

زاہد نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں — ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

وہ لحد پہ بوئے مے تھی کہ نہ آسکے فرشتے
میں عذاب میں پھنسا تھا جو نہ بادہ خوار ہوتا

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کا انداز پایا جاتا ہے جگہ جگہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا سوال ملتے ہیں۔ وہ فلسفی نہیں مگر ان کا انداز فلسفیانہ ہے، مفکر نہیں مگر نظر حکیمانہ ہے۔ اسی لیے پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا ہے کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا۔ ذرا یہ انداز دیکھیے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

غالب اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں اور بلاشبہ وہ اپنے عہد کی آواز ہیں۔ ان کے کلام کی مقبولیت کسی دور میں کم نہیں ہوئی اور یقین ہے کہ ان کے پرستاروں کا دائرہ آئندہ اور بڑھے گا اور اب ملاحظہ فرمائیے ان کے چند اشعار ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

فانی کی غزل گوئی

شوکت علی فانی بدایونی کی شخصیت اردو شعر و ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے دم سے اردو ادب کی آبرو قائم ہے۔ فانی فن اور شخصیت کے اعتبار سے انتہائی بلند مقام پانے کے مستحق ہیں۔ فانی بدایونی کا نام اردو کے ان شعراء میں شامل کیا جاتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کی ابتدائی تین چار دہائیوں میں اردو غزل کو سطحیت، سستی، رکاکت، عامیانہ پن اور ابتذال کی دلدل سے نکال کر صاف ستھرے ماحول میں سجایا اور اس طرح گویا اسے نئی زندگی دی۔ ان شعراء میں فانی نہ صرف شامل ہیں بلکہ ایک اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ غزل گوئی کی حیثیت سے ان شعر کی ایک ایسی انفرادی شان ہے جو انھیں نہ صرف ان کے ہم عصروں ہی میں نہیں بلکہ اردو کے تمام غزل گو شعراء میں نمایاں درجہ عطا کرتی ہے اور ان کی لافانی اہمیت و عظمت کی ضامن ہے۔

فانی نے اپنی شاعری کی عمارت غم کی بنیاد پر تعمیر کی ہے، کسی طرح مناسب نہیں، کیونکہ اول تو اس روش کو اختیار کرنے والے وہ پہلے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی ~~کئی شعراء جنہوں~~ ~~کئی شعراء کو غم~~ کئی شعراء غم کو اساسِ شاعری بنا چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ غم بھی زندگی کی حقیقت ہے اور شاعری زندگی کی عکاسی و ترجمان ہوتی ہے اس لیے غم کو شاعری میں جگہ دینا یا اس کو شاعری کا بنیادی موضوع بنانا کوئی غلط اقدام نہیں کہا جا سکتا۔ جذبۂ غم مسرت کے جذبے سے کہیں زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے اور ہر آدمی خوشی کے مقابلے میں غم کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا جس شاعری کی لے حزنیہ ہوتی ہے وہ نشاطیہ شاعری سے زیادہ پُراثر ہوا کرتی ہے۔ انگریزی کے مشہور شاعر شیلے کا خیال ایک بہت بڑی صداقت ہے کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جن میں ہمارے ~~غمگین~~ غمگین ترین خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ فانی کی المیہ شاعری بھی غمگین ترین خیالات پر مبنی ہے اس لیے اسے بھی اگر "شیریں ترین" کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

فانی کی شاعری کے محاسن اور زبان کی خوبیاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے نکتہ چیں بھی ان کی فنکاری کے قائل و معترف ہیں۔ ان کے کلام میں غضب کی ~~بے ساختگی~~ بے ساختگی، روانی، چستی پائی جاتی ہے ایک طرف تو ان کے طرزِ بیان اور ان کی زبان میں ایسی نزاکتیں

اور حالانکہ میں جو میرے اشعار کی مرہون منت ہیں اور دوسری جانب ان کے اسلوب میں ایسا حسن بھی اشعار اور ان کے لہجے میں ایسی جاذبیت اور اثر اور طرز ادا ہے جو ان کی شاعری کے رنگ کا نتیجہ ہے ان کی شعری لہجے کی زبان ان کے کلام کا وہ وصف ہے جسے کوئی نقاد یا قاری نظر انداز نہیں کر سکتا اردو غزل کی زبان میں بلند ہے ان کے دور میں دوسروں سے جو بات ان کی شاعری کی زبان میں سمٹ آیا ہے فانی نے فنی اور زبان کے معاملے اور فنی مہارت و چابکدستی نے ایسا روپ دے دیا ہے جس پر ان کی انفرادیت کی مہر لگ گئی ہے۔ جو اثرات قبول کیے ہیں انھیں ان کی ذاتی فنکارانہ صلاحیتوں

دل سے پہنچی تو ہیں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشے سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لیے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

فانی کی شاعری میں موت کا جو دل کش تصور ملتا ہے اس کی مثال اردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ موت کا یہ تصور اور الم کا تصور فانی کی شاعرانہ انفرادیت کی نمایاں ترین پہچان ہے۔

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

انیائے نامرادی کے کرب و غم کی ماری ہوئی زندگی میں انھیں "ہر نفس" آرزو بے تاثر ایک جنازہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی طبیعت یہ بات گوارا نہیں کرتی کہ ان کو اپنے وطن سے دور کیا جائے۔ فانی کا یہ غم بھی بہت شدید ہے فانی کو وطن چھوڑنے کا سخت غم تھا وہ آخری ایام میں وطن کو بہت یاد کرتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد میں ایک شاگرد "ماہر" سے کہا ماہر میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح بدایوں پہنچ جاؤں وہیں جا کے مروں۔

فانی ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز غزل گو ہیں ان کی عظمت بھی مسلمہ ہے اور انفرادیت بھی اردو غزل کی تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور ان کے کلام کی اہمیت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہے گی۔

(1)

شہریار

اخلاق محمد خان "شہریار"
پیدائش ۔ 16 جون 1936ء
وفات ۔ 13 فروری 2012ء
فلمی دنیا میں نغمیں لکھے
امراؤ جان ادا فلم کے لیے گانے نغمیں لکھے (1978ء)
خواب کا در بند ہے (1958ء)

شہریار کی شخصیت اردو شعر و ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ شہریار اس دور کے ان ممتاز شاعروں میں سے جنہوں نے اپنی غزلوں اور نظموں کی خواب آلودہ فضاء اپنے مخصوص لہجے اور اس میں معانی کی نت نئی پیرایوں سے سجائے جاتے ہیں۔ بہت سے نئے شاعروں کی آواز اجنبی سی معلوم ہوتی ہے مگر شہریار کی آواز نئی ہونے کے باوجود مانوس ہے۔ اچھی شاعری نئی ہوتے ہوئے مانوس بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف باہر کے درخت کو ہی نہیں دیکھا یا دکھایا بلکہ اپنے اندر بھی ایک باغ اگایا ہے۔ جس کے رنگ اور خوشبو نے ہمارے دلوں کو چھوتی ہیں۔

ماحول میرے شہر کا یاں پرسکوں نہ تھا
نہیں ہے مجھ سے تعلق کوئی تو ایسا کیوں

اے اہلِ درد ہم نے سمجھنے میں دیر کی
کارِ جہاں مانع کارِ جنوں نہ تھا

چاہا بہت کہ دشت کو گلزار کر سکوں
میرے بدن میں خون تو تھا اتنا خون نہ تھا

اس دور کرب و بلا نے انھیں بہت زخم دیے ہیں، مگر وہ ان زخموں پر نالہ و فریاد کرنے کے بجائے مسکراتے ہیں۔ وہ ان کے بیان د
چھوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے لہجے میں ایک حزن اور ملال ہے مگر اس میں لطافت بھی ہے اور تہ داری بھی۔ ان کا کلام
پڑھ کر اور پڑھ کر مجھے اس شکری ہوا کہ مجھے ایسی عبارت کا خیال
ہے کہ جو پانی میں مجھے شکری کا خیال آتا ہے جو پانی میں تیرنے کی لہروں کے

کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے بتاتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں دشت، بیاباں، ویران، صحرا، شہر خواب سب اپنی کہانیاں کہتے رہتے ہیں۔ دوسرے ان کے یہاں محدود اور معقول تجربوں کے مقابلے میں جذبے اور خیال کی بے پناہ آزادی نظر آتی ہے۔ شاید اسی سے ان کا انفرادی ظاہر ہوتا ہے۔ شہریار ترقی کی راہ پر گامزن ہیں اور وہ شاعری کو ان سے اچھی بیت ہے

رہے

دنیا نے ہر محاذ پہ مجھ کو شکست دی
یہ کم نہیں کہ خواب کا پرچم نگوں نہ تھا

شہریار کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں زندگی ہے، حرارت ہے، جوش ہے، حوصلہ ہے۔ ان کی شاعری میں دلکشی پائی جاتی ہے۔ کلاسیکی روایات کی پاسداری ملتی ہے۔ وہ قدیم روایات کو یکسر نظر انداز نہیں کرتے بلکہ قدیم و جدید کے امتزاج سے ان کی غزلوں میں نئے طرز کا احساس ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی طرز احساس میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

تقسیم کا المیہ بہت بڑا المیہ ہے کون شخص تھا جو اس حادثے سے متاثر نہیں ہوا ہوگا۔ شہریار نے بھی اپنی شاعری میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آزادی، تقسیم، فسادات اور ہجرت کے وقت ہونے والے سانحات، عزیز اقارب کی پامالی کا ذکر جب ان کی شاعری میں ہوتا ہے تو ان کے یہاں حزن و الم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر انسانوں کے ذہن، دماغ پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کو انھوں نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

وعدے پہ تیرے میں نے کبھی شک نہیں کیا
پھر تیرا انتظار مجھے رات کیوں نہ تھا

شہریار کی نظموں کا ذخیرہ کچھ کم نہیں تھا۔ انھیں نظم گوئی اور غزل گوئی دونوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔

UNIVERSITY GRANTS COMMISSION
(SELECTION & AWARDS BUREAU)
BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI- 110002

ANNEXURE -III

Scanned with CamScanner

انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی سے فیض اٹھایا تھا۔ ان کی نظموں میں بھی ~~فکر و فن~~ نظمیں بھی فکر و فن کے لحاظ سے کافی بلند مقام پر ہیں۔ ان کی نظموں میں روایت سے بغاوت کے باوجود کلاسیکیت یکسر نظر انداز نہیں ہوئی۔ اس لیے ان کی نظمیں نئی ہونے کے ساتھ فطری بھی ہیں۔ نئے زمانے کے مسائل، عصری حسیت، شہری زندگی، انسانی اقدار کی پامالی، ناکامیاں، محرومیاں، خوشی و غم جیسے موضوعات پر ان کی نظموں کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔

جدید شعراء کے مجمع میں شہریار نے جس طرح اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں میں روایت کی پاسداری کے علاوہ خوشگوار اضافے بھی کیے ہیں اور اظہار کی نئی شمعیں بھی جلائی ہیں۔ ان کی شاعری میں جو انفرادیت ہے وہی ان کی شناخت ہے اور طرزِ اظہار بھی ہے اگر شہریار کی شاعری کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو جدید شاعری کے خلاف جو تعصب دلوں میں پایا جاتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے اور نئی نسل کے شعراء اپنے تخلیقی عمل کے دوران ان کی شاعری سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

...COMMISSION
(SELECTION & AWARDS BUREAU)
BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI...

Scanned with CamScanner

اختر الایمان کی نظم نگاری

یادیں: اختر الایمان کی شاعری کا مرکزی خیال کہا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں ایسی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں یادوں کی دلگدازی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں آپ اختر الایمان کی نظم نگاری کے تحت بھی پڑھ چکے ہیں اور ان کی نظم ایک لڑکا کی تشریح کرتے ہوئے بھی میں نے اس تعلق سے بتایا ہے۔ اب ہم لوگ اختر الایمان کی نظم یادیں پر گفتگو کریں گے۔ یہ پوری نظم اپنے تاثر یا یادوں پر مشتمل ہے۔ شاعر اپنی عمر کی ایک منزل پر پہنچ چکا ہے اور اس مرتبہ پر جلد ہی آتے تھے اس نے بہت کچھ سنا، دیکھا، پایا، کھویا، سہا، برتا، اور اس آباد خرابے میں تماشا بھی بنا اور تماشائی بھی بنا۔ اب شاعر کہتا ہے

ٹوہ لیتے دھرتی کے پسینے اور کبھی تجوری کے مال
ایسے جھوٹے کے اُلٹے جیسے جیو الوٹ ہو دے کنگال
بیانے بن کر بارات بگاڑی بھٹک پڑی سادہ سی چال
چھانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر، کبھی قلندر، کبھی بگولا، کبھی خیال
سوانگ رچائے اور گزری اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شاعر یہاں اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے تو کئی چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں وہ گزرے ہوئے لمحے فلم کی طرح منظر بدلنے جاتے ہیں۔ شاعر یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ یادوں کے یہ بے معنی دفتر ہیں اور گزری ہوئی باتیں ~~نقش~~ ایک دو نقش بر آب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہے

اور کہیں وہ کوئل کوکی، رات کے سناٹے میں دور
کبھی زمین پر بکھرا ہوگا قمر کا میٹھا میٹھا نور
بار مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے، لو دیکھو وہ صبح کا نور
چاہِ شب سے پھوٹ کے نکلا، ہیں مغموم کبھی مسرور
چھوڑ دی یہ منزل بھی سر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

(2)

ellow: MD ASIF ANSARI
umber and date: 28748/ (NET-DEC 2012)
ch work:

اختر الایمان کی نظم نگاری

"یادیں" اختر الایمان کی شاعری کا مرکزی خیال کہا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں ایسی نظموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں یادوں کی دلدادگی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ اس بارے میں آپ اختر الایمان کی نظم نگاری کے تحت بھی پڑھ چکے ہیں اور ان کی نظم "ایک لڑکا" کی تشریح کرتے ہوئے بھی میں نے اس تعلق سے بتایا ہے۔ ابھی آپ ہم لوگ اختر الایمان کی نظم "یادیں" پر گفتگو کریں گے۔ یہ پوری نظم ابتدا تا انتہا یادوں پر مشتمل ہے۔ شاعر اپنی عمر کی ایک منزل پر پہنچ چکا ہے اور اس مرتبہ پر حلیہ پر آتے ہوئے اس نے بہت کچھ دیکھا، پایا، کھویا، سہا، پڑھا، اور اس آباد خرابے میں عاشقانہ بھی بنا اور عاشقانہ بھی بنا۔ اب شاعر کہتا ہے

شور میرے دھرتی کے پیچھے اور کبھی مجبوری کی پھیر مال
ایسے مجبوری کے اٹھتے جیسے چھوڑ لوٹ کر دے کنگال
میانے بن کر بارات بگاڑی بھٹک پڑی سادہ سی چال
مجانا دشتِ محبت کتنا آبلہ پا مجنوں کی مثال
کبھی سکندر، کبھی قلندر، کبھی بگولا، کبھی خیال
سودا نگ دھائے اور گزری، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شاعر یہاں اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے تو کئی چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ شاعر کے ذہن میں وہ گزرے ہوئے لمحے فلم کی طرح منظر بدلتے جاتے ہیں۔ شاعر یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ یادوں کے یہ بے معنی دفتر ہیں اور گزری ہوئی یہ باتیں ~~نقش~~ ~~ایک معمہ~~ نقش بر آب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

اور کہیں وہ کوئل کوکی، رات کے سناٹے میں دور
بکھی ذہن پر بکھرا ہوگا جسم کا میٹھا میٹھا نور
بار مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے تو دیکھو وہ صبح کا نور
جام شب سے بھیڑ کے نکلا، ہیں مخمور کبھی مسرور
جھوٹوں پہ منزل بھی سر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

(2)

e Fellow: MD ASIF ANSARI
r number and date: 28748/ (NET-DEC 2012)
search work:
mencement of research: Muhammad Hasan Askri ki Adabi Khidmat ...
iversity:

Scanned with CamScanner

اس طرح اختر الایمان بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح اپنی نظم "یادیں" میں میلے کی سیر، کھیل کھلونے ان کی سج دھج دیکھنے کے لئے آتی ہیں لیکن جیب میں اس کے ساتھ ساتھ رنگوں قدرتی مناظر کا ذکر بھی بہت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ درخت کے سائے میں کھڑکی کا کونا، آم کے باغ میں کریں شور کوئل کے گانے کا منظر یہ سب اختر الایمان کے نظم یادیں میں پیش کیا گیا ہے۔

زیست خود جانے ہے کیا شے مجھ کو یہ تجسس اب تک خرید
مجبوں سے بچے، زیرہ جیسی، مرد مجسم باغ دنیا کا
مرجھا جاتے ہیں یہ کون ہے وہ جس نے پیار کیا
کیا ہے روح الامیں کو آخر یاد بے زبر بلے افکار
کس بھی ہے آگئے ہیں سب، جینا کیوں ہے اک بیکار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خراب میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خراب میں

لیکن جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں وہ اپنے باپ سے بچھڑتا جاتا ہے اور جب دیکھتا ہے تو جیب میں اور حیران ہو جاتا ہے کہ بازار میں کیا کچھ نہیں بکتا، شرافت، نجابت، محبت، وفا اور اولاد حتیٰ کہ خدا بھی حتیٰ تو یہ کہ لوگ اپنے ضمیر کی لاج بھی بیچنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنے آپ میں کھو جاتے ہیں کبھی روٹی کی تلاش، کبھی روزگار، کبھی عشق، کبھی دشمنوں سے مات کھائی تو کبھی غم زمانہ کا چکر دیا۔ مہوش بھی سادہ مقابل ہیں کہ شبنم جیسی ٹھنڈی لگتی ہیں اور محبوبوں کی میٹھی باتیں بہت میٹھی لیکن زخم جگر پر خلش ہی ملی ہے۔ یادیں ابھر ابھر کر آتی ہیں۔ زندگی زمانے نے بھی کیا کیا رنج دکھائے۔ کبھی جھولی بھری رہی تو کبھی کنگال کی طرح خالی بھی مجنوں کی طرح دشت نوردی کی تو کبھی سکندر کبھی قلندر رہے کبھی بگولوں میں [کیف] میں کیف و سرور رہا۔ زندگی گزری، یہاں نظم میں ٹھہراؤ سا ایک موڑ آتا ہے۔ یادیں نیا منظر سامنے لاتی ہیں پھولوں سے بچے زیرہ جیسی محبوب اور باغ دنیا کی طرح مرد آخر کیوں مرجھاتے ہیں۔ وہ کون ہے جس سے روح الامیں پیار بھی ہوس ہوتی ہے۔

...uer the M.Phil/Ph.D: ...Adabi Khidmat Ek Tanqeedee Mutalea

...l of Progress Report:

...number of working days during the period:

...r of days the fellow remained on leave (with dates):

...fellowship, number of days: from N/A .... to N/A

...out fellowship, number of days: from N/A

Scanned with CamScanner

شاعر آخر میں مجبوراً یہی محسوس کرتا ہے کہ یہ گزری ہوئی باتیں نقش برآب سے بڑھ کر نہیں۔ اس بیہوشی و خرد کی دنیا میں ایسی باتوں کی کوئی وقعت نہیں یہ یادیں "ماضی کی کتاب کھولا ہوا ورق ہے۔ اس آباد خرابے میں اس کا کیا مقام ہے۔

ع

سب کے سب خاموش زبان سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش برآب
مستقبل کی سوچ، ارتقا پر ماضی کی یادیں کتاب
منزل ہے یہ بیہوشی و خبر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

مختصر یہ کہ اختر الایمان کی شاعری گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ اپنے زمانے کی عالمگیر قنوطیت اور سماج کی ملکی ابتری کی موجودگی میں بھی ان کی شاعری ذہنی شگفتگی اور صحت کا باعث رہی یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی برقرار رہے گی۔"

حالاتِ زندگی

اتر پردیش کے ضلع بجنور کا ایک موضع راؤ کھیڑی۔ راؤ کھیڑی ابتدا سے مسلمان راجپوتوں کی بستی ہے۔ اختر الایمان کے بزرگ اپنے آپ کو راجپوت کہتے تھے۔ اختر الایمان کے دادا کا نام اقبال راؤ تھا۔ ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اختر الایمان کے والد فتح محمد ۱۲ جنوری ۱۸۸۴ کو راؤ کھیڑی میں پیدا ہوئے۔ یہ بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک اور ذہین آدمی تھے۔ قرآن شریف حفظ کیا تھا۔ عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔ اردو ہندی میں خوشخط تھے۔ طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اختر الایمان کا کہنا تھا کہ والد کے مزاج میں بے حد ضد تھی اور ان کے والد ہمیشہ کسی نہ کسی بات سے شاکی رہتے تھے۔ اختلاف اور مزاج کی جھگڑالو بنا تھا۔ والد کا پیشہ امامت تھا۔ کہیں مستقل قیام نہ رہا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جایا کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ اختر الایمان سب سے بڑے تھے۔

اختر الایمان ۱۲ نومبر 1915 کو قلعہ پتھر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ پتھر گڑھ ایک چھوٹا سا موضع ہے جو قصبہ نجیب آباد سے ایک دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے اور نجیب آباد کا حصہ ہے۔ پتھر گڑھ اختر الایمان کا ننھیال ہے۔ اختر الایمان کا بچپن کا دور خانہ بدوشانہ رہا۔ امامت کے سلسلے میں ان کے والد اختر الایمان کو ساتھ لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جایا کرتے تھے۔ [illegible] اور اس کے بعد اختر الایمان کو مکتب مدرسے میں شریک کیا گیا جو ایک یتیم خانہ تھا۔ اختر الایمان چکاوَمری میں بھی رہے۔ یہاں ان کے چچا اور چچی دو لڑکوں کے اور [illegible] اپنے ہمراہ دہلی لے گئے [illegible] بعد میں [illegible] یتیم خانہ مؤید الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ایک اسکول بھی تھا۔ اختر الایمان کی ذہنی تربیت میں مؤید الاسلام کے اساتذہ کا بڑا حصہ رہا۔ اس کے بعد انہوں نے فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں انہوں نے اینگلو عربک کالج کا رخ کیا۔ اس کالج کے طالب علم رہتے ہوئے اختر الایمان نے غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔

(۶)

tal number of working days during the period:

mber of days the fellow remained on leave (with dates):
With fellowship, number of days: from..N/A.......... to..N/A..........
Without fellowship, number of days: from..N/A......... to..N/A......

nber of days the MANF Fellow remained out of station for field
s visited: a) Number

Date
15/03/2020

مسجد قرطبہ (علامہ اقبال)

مسجد قرطبہ علامہ اقبال کی ایک شاہکار نظم ہے۔ اردو شعر و ادب میں علامہ اقبال کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک ایسے مایہ ناز شاعر ہیں جن کی کلام کی شہرت ہندوستان و پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک تک پہونچ چکی ہے۔ ان کا کلام کی گہرائی اور معنی خیزی جگ ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض نظموں کے ترجمے دنیا کے کئی زبانوں میں ہو چکی ہے۔ ان کا ان کے کلام میں گہرائی اور فلسفہ پوشیدہ ہے۔ اور ان پر غور کرنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم معلومات کی سمندر میں غوطہ لگا رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہمارے نصاب میں شامل ہے "مسجد قرطبہ" لہذا ہماری گفتگو اس نظم کی روشنی میں ہوگی۔

"مسجد قرطبہ" ایک بہترین نظم ہے جو آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ "مسجد قرطبہ" ہسپانیہ (اسپین) کے خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس مسجد کی بنیاد آٹھویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں رکھی تھی۔ اسکی تعمیر میں مشرق و مغرب کی تمدنی میراث کو نہایت خوبی و سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس انتہائی مضبوط اور خوبصورت مسجد کے اکیس دروازے اور کئی ستون ہیں۔ ؏

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب، ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

اس نظم میں فلسفہ زبان اور تصویر عشق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ وقت کا دریا ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے موت و زندگی اور دیگر حادثات ہوتے ہیں جن میں عجائب پنہاں نما ہو کر ایک صورت میں نئی شکل میں ابھرتی ہیں۔

...BAHADUR SHAH ZAFAR MARG, NEW DELHI- 110002

YEARLY PROGRESS REPORT

Name of the Fellow: MD ASIF ANSARI

Award lett...

مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ "لا الٰہ"
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ "لا الٰہ"

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز

زمانہ انسان کو ہیر کرنے کا کام کرتا ہے اور جو زمانے کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور جو کھوٹا ثابت ہوتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ لیکن وہ کارنامہ جسے مردِ خدا نے انجام دیا ہے وہ ہمیشہ زندہ ہے کیونکہ وہ عشق سے جلا پاتے ہیں اور وہ عشق سے پیدا ہے ہے

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

کون سی وادی میں ہے، تیری زمیں، آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری ~~زمیں~~ فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

مسجد قرطبہ کی لمبائی چھ سو فٹ ہے اور چوڑائی ساڑھے چار سو فٹ۔ اس مردِ خدا کی جاہ و جلال کو دیکھ کر ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ وہی لوگ تھے جو خدا سے خوف ~~کا~~ کھاتے تھے اور اسی کا نام باقی رکھنے کے لئے جیتے تھے۔ لیکن علامہ اقبال افسوس اور حسرت سے یہ کہتے ہیں کہ آج مردِ مسلمان کے دلوں سے عشق کی آگ ~~ختم~~ ختم ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے مسجد قرطبہ

…, NEW DELHI- 110002

YEARLY PROGRESS REPORT

of the Fellow: MD ASIF ANSARI

letter number and date: 28748/(NET-DEC 2012)

f research work:

commencement of research: …

Scanned with CamScanner

ان کے ہاتھ سے نکل گئی وہاں صدیوں سے اذان کی آواز نہیں گونجی ہے لیکن اقبال مایوس نہیں ہوئے ان کا کہنا ہے کہ آج دنیا میں ہر طرف انقلابات ہو رہے ہیں ایک نہ ایک دن مسلمان کے دلوں میں عشق کی آگ جلے گی جو ان کے کھوئے ہوئے عظمت کو پانے حاصل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

نظم کا آخری بند پورے نظم کا نچوڑ ہے کوئی بھی کام بغیر خلوص اور خونِ جگر صرف کئے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی "مسجد قرطبہ" کو بنانے والوں نے اپنا خون جگر صرف کیا اس لئے ان کی فن لازوال بن گئے ۔

الغرض "مسجد قرطبہ" علامہ اقبال کی ایک شاہکار نظم ہے یہ نظم اردو شعر و ادب کی ایک گراں قدر سرمایہ بن گئی ہے ۔ اس نظم میں جذبۂ عشق اور زمانے کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے اس نظم کے تقریباً ہر بند میں خوبصورت نادر تشبیہات، تلمیحات اور استعارات کا استعمال کیا گیا ہے ۔ "مسجد قرطبہ" دنیا کا فنِ عظیم کارنامہ ہے، اسی طرح اقبال کی شاعری اور فکر عظیم اور تاریخی کارنامہ ہے ۔

Name of the Fellow: MD ASIF ANSARI
Award letter number and date: 28748/ (NET-DEC 2012)
Topic of research work:

''تنہائی'' — فیض احمد فیض

بیش تر ترقی پسند شاعری نے ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے نظریات کو شاعری میں برتنے کی کوشش کی، لیکن فیض کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسندی کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے کے ساتھ ہی ادب کی جمالیاتی قدروں کو نظر انداز نہیں کیا اور کمال ہنرمندی کے ساتھ ادب کے فنی تقاضوں کو اپنی شاعری میں پیش کرتے رہے۔ فیض کا شمار ان چنندہ شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف کے ساتھ خاطر خواہ انصاف کرنے کی کوشش کی۔ غزل کا مخصوص آہنگ ان کی نظموں کو وقار بخشتا ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کے منتخب ٹکڑوں پر غزل کے اشعار کا دھوکہ ہوتا ہے۔ لہجے کی نرمی اور شائستگی کو ان کی شاعری میں بہ طور خاص محسوس کیا جا سکتا ہے۔

فیض نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں وہ پوری دنیا میں سیاسی، تہذیبی، معاشی اور اخلاقی انتشار کا عہد تھا۔ بے حد حساس شاعر ہونے کی بنا پر وہ صرف اپنے ملک، اپنے لوگوں کی بدترین حالت دیکھ کر خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوئے، بلکہ پوری دنیا کا غم انھیں ہر لمحہ اندر سے مضطرب کرتا رہا اور وہ پوری انسانیت کے درد و کرب کو دیکھ کر شدت کے ساتھ تڑپتے رہے۔ اسی بنا پر ان کی شاعری میں محسوسات کی سطح پر خاصہ تنوع دکھائی دیتا ہے۔ جس نوع کے موضوعات کو فیض نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے، ویسے ہی موضوعات ان کے دیگر ہم عصروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی سطح پر موجود تو ہیں لیکن ان میں فیض جیسی وسعت مفقود ہے۔

روایت کا مستحکم شعور جہاں ان کی شاعری میں جادو جگاتا ہے وہیں روایت کی فرسودہ قدروں سے انھوں نے حتی الامکان اپنا دامن بچانے کی کوشش بھی کی ہے۔ انگریزی کے ساتھ عربی شاعری کے مطالعے نے انھیں یہ شعور بخشا کہ زمانے میں محبت کے سوا دوسرے غم بھی ہیں اور محبوب کی قربت کے علاوہ راحتوں کے دوسرے وسیلے بھی ہیں۔ انھوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا تھا کہ جس نوع کا کرب انھیں اپنی شاعری میں پیش کرنا ہے، اس کے لیے انھیں

Scanned with CamScanner

نظم کے روایتی انداز کے بجائے لفظ کی اجتہادی جہت کو بروئے کار لانا ہوگا، اور عملی طور پر انھوں نے ایسا کیا بھی جس کی وجہ سے ان کی شاعری پڑھنے والوں سے مختلف قرأت کا تقاضا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں الفاظ تو کم و بیش وہی استعمال کیے جو ان سے قبل شاعری میں مشتمل تھے، لیکن برتے گئے الفاظ کو چوں کہ انھوں نے بالکل مختلف سیاق وسباق میں استعمال کیا، اس لیے ان میں معنویت کی نئی جہتیں واضح طور پر جھلکتی ہیں۔

فیض نے اپنی شاعری کو نعرے بازی سے پوری طرح محفوظ رکھا۔ جذباتیت ان کی شاعری میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ انھوں نے بلند آہنگی سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ لہجے کی نغمگیت برقرار رہے۔ اس خوبی کی بنا پر ان کی شاعری قاری کو متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ وہ اپنی شاعری میں انسانیت کے آفاقی تصور کو پیش کرنے کے دوران اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ شاعری میں بیان کی گئی کیفیت، انسانیت کی مشترکہ کیفیت کی ترجمانی کر سکے۔ نشاطیہ آہنگ کے بجائے وہ زندگی کے درد و کرب کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ سرحدوں کی لکیریں بے معنی ہو جاتی ہیں اور پوری انسانیت کا غم نمایاں ہو جاتا ہے۔ فلسطین اور بیروت کی بدحال زندگی کا نقشہ انھوں نے اپنی نظموں میں جس طرح کھینچا ہے، اس سے ان کے محسوسات کی ہمہ گیری ظاہر ہوتی ہے۔

فیض کے اوّلین مجموعہ کلام ''نقشِ فریادی'' کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ابتدا میں ان کا ذہن عشق و محبت کی خوش رنگ فضاؤں کا اسیر رہا اور شاعری میں اسی نوع کے جلوے دکھائی دیتے رہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انھیں اس بات سے آگاہی ہوتی چلی گئی کہ عشق و محبت کے علاوہ بھی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جن سے ہم نگاہیں نہیں چرا سکتے۔ ان کے بعد کے مجموعے دست صبا، دست تہہ سنگ اور سرِ وادیٔ سینا وغیرہ میں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت احتجاج کی بامعنی پیش رفت دکھائی دیتی ہے۔ ''نسخہ ہائے وفا'' فیض کی کلیات ہے جس میں ان کے مجموعوں کو ترتیب وار طریقے سے جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی کچھ نئی تخلیقات بھی اس کلیات میں موجود ہیں۔

فیض کی مشہور نظموں میں چند روز اور مری جان، مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ، رقیب سے، سرِ وادیٔ سینا، کیا کریں، تنہائی، عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا،

Scanned with CamScanner

فلسطینی بچے کی لوری، یاس، ملاقات، صبح آزادی، موضوع سخن، ایرانی طلبا کے نام، فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے، مرثیہ امام، تم ہی کہو کیا کرنا ہے وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عالمی سطح پر امن وسکون کی فضا قائم کرنے میں ہر ممکن تعاون دیا۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، لیکن قلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی اور ہزار اذیتوں کے باوجود اپنی انا کا سودا نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو برسر اقتدار طبقے کی سرپرستی حاصل کر کے اعزاز وانعام کے نام پر بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے مادی آسائشوں کے لیے اپنے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا اور ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ طنز کی نشتریت ان کی شاعری میں غضب کا کمال دکھاتی ہے، لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈہ ہونے سے بچائے رکھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری درد سے کراہتی زندگی کی ترجمان بن کر آج بھی ہمیں مصیبتوں سے لڑنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔

''تنہائی''، فیض کی مشہور نظموں میں سے ایک ہے، جو کہ معرّیٰ نظم کی ہیئت میں لکھی گئی ہے لیکن شاعر نے اپنی کامیاب نظموں کی طرح اس نظم میں بھی قافیوں کے استعمال سے ایک غنائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کی مناسبت سے نظم میں تنہائی کے مختلف شیڈس واضح طور پر اُبھرتے ہیں، لیکن غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ نظم میں تنہائی کے علاوہ بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن کے توسط سے زندگی کے مختلف منظر ناموں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ کامیاب اور بہتر فن پارہ وہی ہوتا ہے جس میں معنی کی مختلف جہتیں موجود ہوں اور ہر جہت قرینِ قیاس معلوم ہو۔ فیض کی نظم تنہائی میں یہ خوبی موجود ہے۔ ایک مختصر نظم میں بھی انھوں نے بڑے سلیقے سے مختلف نکات شامل کر دیے ہیں جس سے زندگی کے نئے رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ نظم ''تنہائی'' کا متن ملاحظہ ہو۔

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں، کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تھک تھک کے ہر اک راہ گزر

Scanned with CamScanner

اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے چراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فیض نے یہ نظم جب پہلی مرتبہ اپنے استاد محمد دین تاثیر کو سنائی تو انھوں نے بڑے غور سے نظم کو سننے کے بعد برجستہ کہا کہ میں نے طوائف کے حوالے سے اتنی خوب صورت نظم پہلے نہ کبھی سنی، نہ پڑھی۔ فیض اپنے استاد کی زبانی نظم کے متعلق ایسے تاثرات سن کر حیرت زدہ رہ گئے اور وہ چاہ کر بھی اپنی مدافعت میں کچھ عرض نہ کر سکے۔ ممکن ہے دین محمد تاثیر نے فیض کو چھیڑنے کی غرض سے اس نوع کی شوخی دکھائی ہو، لیکن انھوں نے نظم کے حوالے سے برجستہ جو بات کہی وہ بھی بے معنی قرار نہیں دی جا سکتی اور اگر ہم نظم ''تنہائی'' کا تجزیہ اس مفہوم کو سامنے رکھ کر کریں تو وہ توجیہہ بھی ہمیں بہت حد تک منطقی معلوم ہوگی۔ بہتر فن پارہ اپنے اندر معنی کی مختلف جہتیں رکھتا ہے اور ہر پڑھنے والا اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس سے مخصوص معنی مراد لیتا ہے۔

نظم ''تنہائی'' کو فیض نے خود کلامی کے انداز میں لکھا ہے جس میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا ہے، لیکن پڑھنے کے دوران یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔ یہاں شاعر کی ذات معاشرے کے حساس فرد کی نمائندہ ہے جو زندگی میں رونما ہونے والے کسی بھی واقعے سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ معمولی سے معمولی بات بھی اس کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ ہر آہٹ پہ چونک پڑتا ہے، ہر تبدیلی پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور زندگی کے بکھرے ہوئے تاروں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ عنوان کی مناسبت سے نظم میں ''تنہائی'' کا تصور پوشیدہ تو ضرور ہے لیکن یہ ''تنہائی'' اکیلے پن سے بہت حد تک مختلف ہے۔ یہ وہ تنہائی نہیں جو مشینی عہد میں سانس لیتے ہوئے فرد کا مقدر بن چکی ہے، جہاں محفلوں میں شامل ہو کر بھی انسان، تنہائی کی اذیتوں سے دوچار رہتا ہے۔ یہ وہ تنہائی ہے جو تہذیب کی شکست و ریخت کے بعد حساس فرد کے ذہن کا لازمی جزو بن چکی ہے۔ یہ وہ تنہائی ہے جو اخلاقی زوال کے بعد حساس فرد کو ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر رہی ہے۔ یہ وہ تنہائی ہے جو سیاسی خلفشار کے بعد حساس فرد کو معاشرے میں زندگی کا زہر پینے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

دراصل اس نظم میں فیض نے تنہائی کی مجموعی کیفیت کو پیش کرنے کے بجائے تنہائی کے شدید احساس کو فن کاری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ شاعر نے خود کلامی کے انداز کو موثر بنانے کی غرض سے ''دل زار'' کو ایک کردار کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کسی اور سے نہیں بلکہ اپنے دل سے باتیں کر رہا ہے۔ چوں کہ یہ حساس فرد کا دل ہے، لہٰذا اس کے معاملات ذرا مختلف ہیں۔ نظم کے پہلے ہی مصرعے میں حساس فرد اپنے دل سے براہ راست مخاطب ہے ـــــ ''پھر کوئی آیا دلِ زار، نہیں کوئی نہیں'' گویا کہ پہلے مصرعے میں دو کرداروں کے مابین گفتگو کا واضح اشارہ موجود ہے۔ پہلے مصرعے کے پہلے ٹکڑے میں وہی کردار (یعنی شاعر کی ذات) دوسرے کردار (یعنی دلِ زار) سے کسی کی آمد کے متعلق استفسار کر رہا ہے اور پہلے مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں دلِ زار کی جانب سے شاعر کی ذات یعنی حساس فرد کے اس سوال کا جواب نفی کی صورت میں دیے جانے کا بیان ہے۔ گویا کہ نظم کی ابتدا واہمے سے ہوتی ہے لیکن اگلے ہی پل اس کی نفی کے بعد واہمے پر قیاس کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ قیاس آرائی کے اس عمل میں حساس فرد کے مکمل وجود کے بجائے اس کے دلِ زار کا دخل ہے جو کسی کی آمد کے واہمے کو یک لخت مسترد کرتے ہوئے کسی راہ ہرو کے ہونے کا قیاس کر رہا ہے جو کہیں اور چلا جائے گا اس لیے کہ وہ راہی ہے، مسافر نہیں۔

نظم کے ابتدائی مصرع میں کسی کے آنے کا بیان، توجہ طلب ہے اور اس مصرع کے دوسرے ٹکڑے میں ''نہیں، کوئی نہیں'' کہہ کر دلِ زار کی جانب سے اس کی نفی کے ذکر سے نظم کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ شاعر واہمے پر نظم کی بنیاد کیوں رکھ رہا ہے۔ وہ آخر کون ہے جس کے آنے کے خیال سے شاعر اس قدر بے چین ہے کہ کسی بھی آہٹ پر اس کے آنے کا گمان اسے ہوتا ہے۔ پوری نظم کے متن کو ہم پیش نگاہ رکھیں تو ہمیں یہ سمجھتے دیر نہیں لگے گی کہ ہر آہٹ پر جس کے آنے کا گمان شاعر یا حساس فرد کو ہو رہا ہے، وہ خوشیوں کی نوید لانے والا پیغام بر ہے، جس کی راہ حساس فرد نہ جانے کب سے دیکھ رہا ہے۔ بے چینی کے ساتھ وہ پیغام بر کی راہ اس لیے دیکھ رہا ہے تا کہ وہ زندگی کی نئی تعبیروں سے روشناس کرائے، تا کہ راہ سے بھٹکی ہوئی زندگی کو منزل کا سراغ مل سکے، تا کہ آنکھوں میں پلنے والے خوب صورت خواب حقیقت میں تبدیل ہو سکیں۔ بار بار کسی کے آنے کی راہ دیکھنا، یا ہر آہٹ پر کسی کے آنے کا دھوکہ

Scanned with CamScanner

ہونا دراصل شاعر یا حساس فرد کی مضطرب ذہنیت اور اندرونی احساس کو نمایاں کر رہا ہے۔ حساس فرد کی ذات اتنی مضطرب کیوں ہے؟ آخر کن وجوہات کے پیش نظر ہر آہٹ پر کسی کے آنے کا گمان اسے ہو رہا ہے اور وہ کیوں چاہتا ہے کہ کوئی آئے اور اس کی اذیتوں میں شریک ہو، اسے تنہائی سے نجات دے۔

فیض نے ناسازگار حالات کا کوئی اشارہ نظم میں پیش نہیں کیا، لیکن ابتدائی مصرعے میں کسی کے آنے کی شدید خواہش کا بیان جس انداز میں کیا گیا ہے، اس سے ذہن میں ناگفتہ بہ صورت حال کی تصویر روشن ہو جاتی ہے۔ چوں کہ واہمہ امید سے وابستہ ہے اس لیے زندگی کی نئی امنگیں نئے تناظر میں جلوہ گر ہو رہی ہیں، لیکن جب دل زار کی بدولت واہمے کو مسترد کر دیا جاتا ہے تو نظم کے بقیہ مصرعوں میں محرومی، مایوسی اور لاحاصلی کا احساس غالب آ جاتا ہے۔ رات کے ڈھلنے کی بات کی جاتی ہے، تاروں کے غبار کے بکھرنے کا بیان کیا جاتا ہے، ایوانوں میں خوابیدہ چراغ کے لڑکھڑانے کا ذکر ہوتا ہے، راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزر کے سونے کا حوالہ دیا جاتا ہے، اجنبی خاک کے ذریعے قدموں کے چراغ کے دھندلانے کا اشارہ فراہم کیا جاتا ہے، شمعوں کے گل کرنے اور بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے اور آخر میں اس افسوس ناک اعلان پر نظم کا اختتام ہوتا ہے کہ اب یہاں کسی کے آنے کی کوئی امید نہیں رہ گئی ہے۔ گویا کہ نظم میں بیان کی جانے والی زندگی کی منفی صورت حال، حساس فرد کے واہمے کے مسترد ہونے کی بنا پر ہی سامنے آپائی ہے، اور اسی بنا پر پوری نظم میں حزینہ لے اور اضمحلال کی کیفیت حاوی ہے۔

فیض کی یہ نظم ایمائیت اور اشاریت کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم میں انھوں نے بہت کم لفظوں کے سہارے جذبات کی جیسی تصویر کشی کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ رات کے ڈھلنے کی بات کہہ کر شاعر نے انتظار کے طویل سلسلے کے خاتمے کا اشارہ دیا ہے۔ انتظار کا خاتمہ، امید کا خاتمہ ہے۔ تاروں کی چمک دمک کے غبار میں تبدیل ہونے کا ذکر جب شاعر کرتا ہے تو حالات کی ستم ظریفیاں پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ وہ تارے جو اپنی چمک دمک سے راہوں کو منور کرتے تھے، اب ان میں وہ تابناکی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ گویا کہ زندگی کی روشن قدروں سے محرومی حساس فرد کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔ یہاں نظم کا راوی یعنی حساس فرد، محض

Scanned with CamScanner

معاشرے کے فرد واحد کی نمائندگی نہیں کر رہا ہے بلکہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کے محسوسات کو اس روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ معاشرے کے عوام تو حالات کی سنگینیوں کا شکار ہیں ہی، خواص بھی ناموافق صورت حال کی زد سے محفوظ نہیں رہ گئے ہیں۔ اس لیے شاعر ایوانوں میں خوابیدہ چراغ کے لڑکھڑانے کی بات کر رہا ہے۔ خوابیدہ چراغ کی اصطلاح پر غور کریں۔ چراغ روشنی کی سوغات تقسیم کرتا ہے اور دنیا کو تاریکیوں سے نجات دلاتا ہے، لیکن یہاں فیضؔ نے چراغ کے خوابیدہ ہونے کی بات کہی ہے جو کہ اب لڑکھڑانے لگے ہیں۔ گویا کہ شاعر نے چراغ کو بھی ایک جیتے جاگتے کردار کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب سجاتا ہے، لیکن سنگینیٔ حالات کے سبب ان خوابوں کو خوب صورت تعبیریں نہیں مل پا رہی ہیں اور ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے ہیں۔

خوابیدہ چراغ کے ساتھ ہی ساتھ فیض نے اس نظم میں راہ گزر کو بھی ایک کردار کی حیثیت سے اجاگر کیا ہے۔ شاعر کے مطابق ہر ایک راہ گزر راستہ تک تک کے آخر کار سو گئی ہے۔ نظم کی قرأت کے دوران فوراً ہی یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ آخر کوئی تو ہے جس کے آنے کی راہ ہر ایک راہ گزر دیکھ رہی ہے۔ اس خیال کا رشتہ نظم کے پہلے مصرعے سے قائم کرنے پر دل کو یک گونہ سکون ملتا ہے کہ پھر کسی کے آنے کا واہمہ ابتدائی مصرعہ میں جس طرح ظاہر کیا گیا تھا، وہ اب محض واہمے کی حیثیت نہیں رکھتا کیوں کہ کسی کا راستہ تک تک کے آخر کار سو جانے کی بات بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ کوئی تو ضرور ہے جو آنے والا ہے اور اب تک نہیں آیا ہے۔ نظم کے اگلے مصرعے میں قدموں کے چراغ کے دھندلانے کا بیان ہے جس کا سبب اجنبی خاک ہے۔ یہ دونوں اشارے بعض پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور و خوض کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ قدموں کے نشان سے منزل کا سراغ ملتا ہے، گویا کہ نقشِ پا کی حیثیت چراغ کی ہوتی ہے جس کی بدولت منزل تک رسائی میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے، لیکن قدموں کے چراغ، اجنبی خاک کی وجہ سے دھندلا گئے ہیں۔ یعنی اس راہ سے کسی اجنبی قافلے کا گزر ہوا ہے، جس کی خاک سے پورا منظر ہی غبار آلود ہو گیا ہے۔

اجنبی خاک کے ذریعے قدموں کے چراغ کی دھندلاہٹ کا بیان سفر کی لاسمتیت اور زندگی کی لاحاصلی کو ظاہر کرتا ہے جس سے یاس و محرومی کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے، جس کی

Scanned with CamScanner

بنا پر حساس فرد اپنے دل کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ اب تمام شمعوں کو بجھا دینا چاہیے کیوں کہ تاریکی جس طرح زندگی کو اپنے حصار میں لیتی جا رہی ہے، اس بنا پر مستقبل میں امکانات کی راہیں روشن نہیں ہو سکتیں۔ وہ مے و مینا و ایاغ سے بھی اجتناب برتنے کا مشورہ دیتا ہے کیوں کہ اب زندگی کی تمام تر رونقیں ماند پڑنے لگی ہیں اور اب ایسی حالت میں وہ اپنے دل کو اس تلخ حقیقت سے آگاہ کرانے میں ذرا بھی نہیں جھجھکتا کہ اب اسے اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لینا چاہیے کیوں کہ اب کسی کے آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بے خواب کواڑوں کے مقفل کرنے کی بات کہہ کر شاعر نے بے حد افسوس ناک صورت حال کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ خوابوں سے محرومی کی صورت میں اجاگر ہوتی ہے۔ جب تک ہم خوابوں کے دامن میں پناہ لیتے ہیں ہمیں زندگی کی تلخیوں سے بہت حد تک نجات ملتی ہے۔ ہم سوتے جاگتے جن خوابوں کو نگاہوں میں بساتے ہیں وہ عملی طور پر واہمے کی صورت زندگی میں اپنی جھلک بھی دکھاتے رہتے ہیں، لیکن آنکھوں سے خوابوں کی محرومی زندگی کی سب سے بڑی محرومی کو نمایاں کرتی ہے۔ بے خواب کواڑوں سے شاعر کی مراد حساس فرد کی آنکھیں ہیں جو حقیقت کی تلخیوں کے باعث خواب دیکھنے کی صفات سے بھی محروم ہونے لگی ہیں اور اس سفاکانہ عمل میں پورے معاشرے کی ستم ظریفیاں شامل ہیں۔ بے خواب کواڑوں یعنی ویران آنکھوں کو شاعر بند کرنے کا مشورہ اس لیے بھی دے رہا ہے کہ اب ان آنکھوں میں خوابوں کا گزر بھی نہیں ہوگا۔ اس محرومی سے بدتر عذاب کا تصور بھی ممکن نہیں۔

●

Scanned with CamScanner

مسجد قرطبہ

نظم "مسجد قرطبہ" اقبال کا لافانی شاہکار اور اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار ہے۔ قرطبہ کی عالی شان اور لاثانی مسجد ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی چھ سو سالہ تاریخ زبانِ حال سے سنا رہی ہے۔ چودہ سو سال پہلے طارق بن زیاد نے سمندر پار کر کے یہاں فتح کا جھنڈا گاڑا تھا۔ ہسپانیہ کا وہ پہاڑی علاقہ جہاں پہلی بار اس مجاہد کے قدم پڑے تھے، اس کے نام سے منسوب ہو کر جبل الطارق کہلایا اور بگڑ کر جبرالٹر ہو گیا۔

سمندر پار کرنے کے بعد طارق نے اپنے بیڑے کو نذرِ آتش کر دیا تاکہ یہاں سے واپسی کا خیال بھی نہ آسکے۔ پھر اس نے خدا سے فتح و نصرت کی دعا مانگی اور اپنے سپاہیوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ہمارے سامنے دشمن کی بھاری فوج ہے اور پیچھے گہرا سمندر۔ اب یا تو ہمیں دشمن پر فتح حاصل کرنی ہے یا شہید ہو جانا ہے۔ مسلمان سپاہیوں نے ایسی بہادری سے جنگ کی کہ طاقتور دشمن کو زیر کر کے ہسپانیہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ چھ سو برس یہ ملک ان کے زیرِ نگیں رہا مگر عیش و عشرت کی زندگی ان کی بربادی کا سبب بنی اور ہسپانیہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس سرزمین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ گیا۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں نے ایک ایسی شاندار مسجد تعمیر کی کہ دنیا کی کوئی عبادت گاہ فنِ تعمیر میں اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ مسجد قرطبہ جامع دمشق کے نمونے پر تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر و تزئین میں یکے بعد دیگرے کئی بادشاہوں نے دلچسپی لی تب کہیں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس زمانے میں اس کی تعمیر پر ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ خرچ ہوا تھا۔ مسجد کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں سنگ مرمر کے ۱۴۱۷ ستون ہیں۔ مسجد میں اجالا کرنے کے لیے ہر رات دس ہزار جھاڑ فانوس اور ۱۴۸۰ پیالے روشن

کیے جاتے تھے۔ تین سو فراش اس کی صفائی کے لیے مقرر تھے۔

ہسپانیہ میں مسلمانوں کے عروج کی داستان جتنی ولولہ انگیز ہے، ان کی بربادی کا قصہ بھی اتنا ہی عبرتناک ہے۔ مسلمانوں کے ملک بدر کیے جانے کے بعد یہ مسجد اذان سے محروم ہوگئی۔ عیسائیوں نے اس میں کئی چرچ تعمیر کرلیے اور دیواروں پر کندہ آیاتِ قرانی کو پلاسٹر سے چھپا دیا۔ سفر یورپ سے واپسی میں اقبال اسپین بھی گئے اور اس مسجد کی زیارت کی۔ اقبال نے اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جتنی دیر میں ان کی درخواست کا جواب ملے، اقبال نے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا۔ ان کے رفیقوں نے کیمرے کا بٹن دبا کر اس منظر کو ہمارے لیے محفوظ کرلیا اور اقبال نے یہ نظم لکھ کر اسپین میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا۔

نظم کا خلاصہ مختصر لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ شاعر وقت کی اہمیت کے بیان سے نظم کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وقت بڑا بے رحم ہے، یہ ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ البتہ وہ چیزیں وقت کی دستبرد سے محفوظ رہتی ہیں جن کی تخلیق میں جذبۂ عشق کارفرما ہو۔ چونکہ مسجد قرطبہ کی تعمیر جذبۂ عشق کی بدولت ہوئی۔ اس لیے یہ فن کا وہ لاثانی معجزہ ہے جسے کبھی فنا نہیں۔ اس کے بعد شاعر مسجدِ قرطبہ کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تیری تعمیر مردِ مومن کے ہاتھوں ہوئی۔ اس لیے جس طرح وہ جلیل و جمیل ہے اسی طرح تو بھی جلیل و جمیل ہے۔ اس کے بعد کئی شعروں میں مسجد کی اور مسجد تعمیر کرنے والے مردِ مسلماں کی تعریف ہے اور اس عقیدے کا اظہار کیا گیا ہے کہ مومن کبھی صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ نیز ان شہسواروں کا ذکر ہے جنھوں نے سرزمینِ اندلس کو ہمدوشِ آسماں کردیا۔ پھر ان شہسواروں کی بدنصیبی کا ذکر ہے کہ ان کی بنائی ہوئی یہ عظیم الشان مسجد صدیوں سے محرومِ اذان ہے۔ ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی دی گئی ہے کہ اہلِ ہمت کا وہ کارواں جو یہاں انقلاب برپا کردے گا، اب یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ نظم کے آخر میں ہم شاعر کو دریائے کبیر کے کنارے مستقبل کے خواب میں کھویا ہوا دیکھتے ہیں اور یہ خواب ہے مسلمانوں کے آفتابِ اقبال کے ازسرِ نو طلوع ہونے کا۔

اقبال کا فلسفہ اس نظم میں پوری آب و تاب کے ساتھ پیش ہوا ہے۔ شاعر کے نظامِ فکر میں وقت کو کیا مقام حاصل ہے یہ پہلے بند کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے۔ اقبال نے کئی جگہ وضاحت کی ہے کہ دن اور رات کا یہ سلسلہ جسے ہم زمانہ کہتے ہیں درحقیقت زمانِ حقیقی کی ایک رو ہے جس میں نہ دن

ہے نہ رات، نہ ماضی ہے نہ حال اور نہ مستقبل۔ اسی سے وہ زمانہ پیدا ہوتا ہے جو دن اور رات کے دائرے میں قید ہے اور زمانِ مسلسل کہلاتا ہے۔ اس بند میں زمانے کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانہ بہت بڑا پارکھ ہے، یہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتا ہے اور فن کے اعلا سے اعلا نمونے کو آخر کار ٹھکرا دیتا ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا　　نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

فلسفۂ عشق کو اقبال کے نظامِ فکر میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نظم کا دوسرا بند شاعر کے فلسفۂ عشق کو واضح کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق ابدی و جاودانی یعنی کبھی نہ فنا ہونے والا جذبہ ہے۔ عشق ہی کائنات کے وجود میں آنے کا سبب ہے۔ یہ جذبۂ عشق ہی ہے جس نے ایک مشتِ خاک یعنی انسان کو اتنا ارفع و اعلا مقام عطا کیا۔ اقبال نے عشق کو دمِ جبرئیل اور دلِ مصطفیٰ سے تشبیہ دی ہے، اسے مجاہدوں کی فوج کا سردار کہا ہے اور دنیا کے لیے اسے باعثِ رحمت بتایا ہے۔ نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ عشق زمانِ مسلسل سے بالاتر ہے اور زمانِ خالص سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے نہ عشق فنا ہو سکتا ہے اور نہ وہ شے مٹ سکتی ہے جو عشق کی بدولت وجود میں آئی ہو۔

تیسرے بند میں مسجد قرطبہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ "اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود" اس لیے عشق کی طرح تو بھی لافانی ہے۔ ثبوت یہ کہ آج اسپین میں مسلمانوں کا وجود نہیں لیکن تو اب بھی ان کی عظمتِ رفتہ کی داستان سنا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت" یعنی مصوری، عمارت، موسیقی اور شاعری۔ جملہ فنونِ لطیفہ اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں کہ ان میں فنکار کا خونِ جگر یعنی خلوص، دوسرے لفظوں میں جذبۂ عشق کارفرما ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ اے مسجد قرطبہ، تیری طرح میری شاعری کی بنیاد بھی اسی جذبے پر ہے۔ اس لیے اگر تیری فضا میں دلوں کو منور کرنے کی صفت پائی جاتی ہے تو میری شاعری دلوں میں سوز و گداز پیدا کرتی ہے۔ اور جس چیز نے انسان کو فرشتوں پر فوقیت دلائی وہ یہی جذبۂ عشق تھا۔ بند کا خاتمہ اس بیان پر ہوتا ہے کہ اے مسجد قرطبہ تیری زیارت سے میرے دل میں آتشِ عشق تیز تر ہو گئی، زبان پر صلوٰۃ و درود جاری ہو گئے میں عشقِ الٰہی سے سرشار ہو گیا اور اسی کیفیت میں یہ نظم وجود میں آ گئی۔

Scanned with CamScanner

چوتھے بند میں شاعر کہتا ہے اے مسجد قرطبہ! تو جلال و جمال کا مجسمہ ہے۔ یقیناً۔ یہی صفات تجھے تعمیر کرنے والے مرد مومن میں بھی پائی جاتی ہوں گی۔ تیری بنیادیں پائیدار ہیں اور تیرے ستون اسی طرح بے شمار ہیں جیسے صحرائے شام میں کھجور کے درخت۔ تیرا بلند مینار جبرئیل کی جلوہ گاہ ہے اور تیرے در و بام پر خدا کا نور برس رہا ہے۔

اے مسجد! تیری پائیداری اور تیرا شکوہ یہ خبر دیتے ہیں کہ تجھے تعمیر کرنے والے یعنی مسلمان کو مٹا دینا سہل نہیں کیونکہ وہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کی شریعت کا امین و پاسباں ہے۔ اس نے پیغامِ خداوندی کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ وہ مرد سپاہی ہے اور خدا اس کا نگہبان ہے۔

مرد مومن کے اوصاف پانچویں بند میں بیان ہوئے ہیں۔ فقر مرد مومن کی سب سے اہم خصوصیت ہے جس کی بدولت یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اور یہ وہ ہاتھ ہے جو بہر صورت غالب رہتا ہے اور کارکشائی اور کارسازی یعنی بگڑے کاموں کو بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سرکارِ دو عالم کے نقشِ قدم پر چلنے سے مرد مومن میں صفاتِ الٰہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا دل دونوں جہاں سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ کی خوشنودی کا خواستگار ہوتا ہے۔ اعلا مقاصد اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس کی محبت میں ریشم کی نرمی اور استقامت میں فولاد کی سختی ہوتی ہے۔ خالق کائنات پر اس کا ایمان غیر متزلزل ہوتا ہے مگر کائنات کو وہ محض فریب نظر خیال کرتا ہے۔ عقل و عشق کی دولت سے مالا مال اس مرد مومن ہی کے دم سے اس دنیا کی ساری رونق ہے۔

چھٹے بند کی شروعات مسجد کی تعریف سے ہوئی ہے۔ اسے اربابِ فن کا کعبہ، حرم کا ہم رتبہ اور دین اسلام کی شان کہا گیا ہے۔ مسجد قرطبہ کی شوکت و عظمت شاعر کو ان عرب شہسواروں کی یاد دلاتی ہے جنھوں نے سرزمینِ اندلس پر اسلامی پرچم لہرایا، جو بہترین اخلاق رکھتے تھے، جن کے علم و حکمت سے اہل یورپ نے فیض اٹھایا۔ پھر خیال آتا ہے کہ ہسپانیہ ان سے خالی ہو گیا لیکن ان کا خون اہل ہسپانیہ کی رگوں میں باقی رہ گیا۔ ہسپانوی قوم کا حسن و جمال، ان کی چشم غزال، ان کا حسنِ اخلاق یہ سب ان عرب شہسواروں کی عطا ہے ـــ

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اسکی ہواؤں میں ہے　　رنگ حجاز آج بھی اسکی نواؤں میں ہے

نظم کا ساتواں بند شاعر کے دلی رنج و غم اور شدید اضطراب کا پتا دیتا ہے۔ یہ خیال اسے تڑپا رہا ہے کہ مسجد قرطبہ صدیوں سے ویران اور بے اذان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ سرفروش مجاہدوں کا قافلہ سرزمین اندلس پر پھر سے اسلامی پرچم لہرانے ضرور یہاں پہنچے گا مگر خدا جانے کب! شاعر کو اس قافلے کا کتنی بے چینی سے انتظار ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے ــــ

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے　　عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

اس کے بعد شاعر کہتا ہے کہ جرمنی، فرانس اور اٹلی میں کیسے کیسے انقلاب رونما ہو چکے، دیکھیے عالم اسلام ایسے انقلاب سے کب روشناس ہوتا ہے!

رجائیت فکرِ اقبال کے بنیادی عناصر میں سے ایک ہے۔ اسپین میں مسلمانوں کی بربادی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے باوجود اقبال ملت اسلامیہ سے مایوس نہیں۔ وہ چشم تصور سے مسلمانوں کے اقبال کا سورج پھر سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ خوش خبری نظم کے آٹھویں یعنی آخری بند میں سنائی جاتی ہے۔

نظم کے آخری تین شعروں میں شاعر تین نہایت اہم نکتے بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے زندہ قوم وہ ہے جو انقلابات پیہم سے دوچار ہوتی رہے، جو قوم اپنے اعمال کا ہر دم محاسبہ کرتی رہتی ہے وہ ضرور اقوام عالم میں سرفراز ہوتی ہے اور وہ قوم جو اپنے سامنے کوئی واضح مقصدِ حیات رکھتی ہے اور ایسی لگن کے ساتھ اسے حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی ہے جس میں جذبۂ عشق کی سی شدت پائی جائے تو وہ قوم کامیاب و کامران ہو کے رہتی ہے۔

غرض یہ نظم اقبال کے اہم افکار کا مجموعہ ہے۔ اس سے اقبال کا تصور زماں واضح ہوتا ہے یعنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وقت کیا ہے اور کائنات میں اس کا کیا رول ہے، اس سے اقبال کے فلسفۂ عشق پر روشنی پڑتی ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ مردِ مومن کے اوصاف کیا ہیں؛ جہد و عمل سے وہ کیسے کیسے معرکے سر کر سکتا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رجائیت فکرِ اقبال کا ایک اہم پہلو ہے۔ مایوسی کو وہ کسی بھی صورت میں اپنے نزدیک نہیں آنے دیتے۔

فنی تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "مسجد قرطبہ" اقبال کی طویل نظموں میں سب

Scanned with CamScanner

سے بہتر اور بلند رتبہ نظم ہے۔ شعریت، رمزیت و ایمائیت، حقیقت و روحانیت اس نظم میں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔ فکر و فن کے جس زاویے سے نظر ڈالیے، یہ نظم محاسن شعری کا مجموعہ نظر آتی ہے۔

فکری عنصر سے شاعری کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ شاعری فلسفہ و فکر سے جتنی دور رہے اس کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے اور یہ کہ شاعری کا کام حظ اندوزی ہے نہ کہ پیغام بری۔ مطلب یہ کہ شاعری کا اصل مقصد ہے پڑھنے والے کو مسرت عطا کرنا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ شاعری میں کوئی فلسفہ، کوئی پیغام بھی موجود ہو اور شعریت بھی کم نہ ہو تو وہ اعلا درجے کی شاعری کہلانے کی مستحق ہے۔ مسجد قرطبہ کی دلکشی کا اصل راز یہی ہے کہ یہاں فکر و فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ عشق، تصورِ زمان، فلسفۂ جہد و عمل، مردِ مومن کے اوصاف، اسپین کی تاریخ، مسجد قرطبہ کی تفصیل — کیا ہے جو اس نظم میں موجود نہیں مگر اسے شاعر کے فن کا معجزہ کہیے کہ یہ ساری چیزیں نظم کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہیں اور اسے دنیا کی عظیم نظموں کے پہلو میں جگہ دلاتی ہیں۔

حسنِ تعمیر کے لحاظ سے بھی یہ نظم لاجواب ہے۔ بعض ناقدین کو اس نظم میں غزل کا سا انتشار اور بے ربطی نظر آئی لیکن یہ خیال درست نہیں اور نظم کو محض سرسری نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ نظم ایک بے نظیر عمارت کے بارے میں ہے اور خود اس نظم میں تعمیر کا لاجواب حسن نظر آتا ہے۔ جس طرح اینٹ پر اینٹ رکھنے سے دیوار اٹھتی ہے بالکل اسی طرح یہاں ایک بند دوسرے بند سے پیوست ہوتا جاتا ہے اور نظم کی پرشکوہ عمارت تعمیر ہو جاتی ہے بلکہ یہ تو ایک میکانکی عمل ہے۔ اس نظم کا معاملہ پودے کا سا ہے جس سے ایک شاخ نکلتی ہے پھر اس شاخ سے شاخ پھوٹتی ہے یہاں تک کہ ایک تناور درخت وجود میں آجاتا ہے۔ نظم کے ارتقا میں یہی فطری عمل کارفرما ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے اور نظم تکمیل کو پہنچ جاتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ "وقت بڑا ظالم ہے ہر شے کو مٹا دیتا ہے" دوسرے بند میں کہا جاتا ہے "مگر وہ چیزیں جو عشق کے طفیل وجود میں آئیں لافانی ہیں" اسی طرح تیسرا بند بھی دوسرے بند سے پیوست ہے۔ شاعر کہتا ہے "اے مسجد قرطبہ! تجھے تعمیر کرنے والے جذبۂ عشق سے سرشار تھے اس لیے تو بھی لافانی ہے۔" اسی طرح آخر تک ایک بند دوسرے بند سے اور ایک خیال دوسرے خیال سے مربوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

لفظ و معنی کی ہم آہنگی کی بھی یہ نظم بہترین مثال ہے۔ لفظ بالکل موضوع کی مناسبت سے منتخب کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کی یہ داستان شاعر کو جذباتی بنا سکتی تھی لیکن انھوں نے جذباتیت

سے دامن بچایا اور نہایت سنجیدہ و متین لب و لہجہ اختیار کیا۔ قرطبہ کی اس پرشکوہ مگر ویران مسجد سے جمال کی بہ نسبت جلال زیادہ ٹپکتا ہے۔ اس کی تصویر کشی رنگین بیانی کا نہیں بلکہ کسی حد تک کھردرے پن کا تقاضا کرتی تھی۔ اقبال نے یہی راستہ اختیار کیا۔ شیریں اور سبک الفاظ کے بجائے پرشکوہ و پروقار الفاظ استعمال کیے اور ان کی ترتیب بھی ایسی رکھی کہ نظم کو بہ آوازِ بلند پڑھیے تو مسجد کی عالی شان عمارت اٹھتی اور ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔

لفظوں اور فقروں کی تکرار معنی کی تہوں کو کھولتی اور ان میں شدت پیدا کرتی ہے۔ پہلے بند کے پانچ مصرعوں میں "سلسلۂ روز و شب" کی تکرار ہے جو روز و شب کے تسلسل و تواتر کو ظاہر کرتی ہے اس کے علاوہ بھی قدم قدم پر تکرار کی مثالیں موجود ہیں۔

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

یہ مثالیں پہلے بند سے پیش کی گئی ہیں۔ باقی نظم میں بھی یہی صورت ہے جس سے نظم کی دلکشی اور تاثیر دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

پیکر تراشی، جو بعض ناقدوں کے نزدیک شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے، اس نظم کا نمایاں وصف ہے۔ اردو شاعری میں پیکر تراشی کے جتنے اچھے نمونے کلامِ اقبال سے پیش کیے جا سکتے ہیں کسی اور شاعر کے کلام سے پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اس نظم کے ہر بند میں طرح طرح کے پیکر موجود ہیں۔ کوئی پیکر آنکھوں کے لیے مسرت کا سامان فراہم کرتا ہے، کوئی کانوں پر جادو کرتا ہے۔ کوئی سونگھنے کی قوت کو متاثر کرتا ہے۔ یہ بصری، سماعی اور شامی پیکر کہلاتے ہیں۔

پہلے بند میں شاعر رات اور دن کے تسلسل کو ایک مصور کہتا ہے۔ نت نئے حادثوں کی تصویریں جس کے موقلم کا نتیجہ ہیں۔ پھر دن اور رات کی سپیدی اور سیاہی کو رنگین ریشم سے تشبیہ دیتا ہے جس سے ذاتِ مطلق کی قبائے صفات تیار ہوتی ہے۔ پھر وقت کو تند و سبک سیر ندی اور عشق کو سیلاب بتاتا ہے۔ ایک بند میں مسجد کے ستونوں کو کثرت کے سبب صحرائے شام کے درختوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ نظم کے

آخری بند میں دھندلکے کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ اقبال جب اپنا مخصوص پیغام پیش کرنا چاہتے ہیں تو وہ ایسا پر سکوت منظر پیش کرتے ہیں کہ قاری کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز ہو سکے۔ شام کا وقت ہے سورج غروب ہو چکا۔ شفق پھول رہی ہے۔ دخترِ دہقاں کوئی درد بھرا گیت گا رہی ہے۔ ایسے میں دریائے کبیر کے کنارے ہمارا شاعر مستقبل کا خواب دیکھنے میں محو ہے۔

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب　　لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت　　کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

یہ تین شعر ایک سناٹے کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور ایک پراسرار منظر ہمارے پیش نظر ہوتا ہے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہم اس فضا میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہمیں پوری طرح گرفت میں لے لینے کے بعد شاعر تین شعروں ہی میں اپنا پیغام پیش کرتا ہے جس کا ایک ایک نقطہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ پیکر تراشی میں اقبال کو کمال حاصل ہے اور جو نظمیں اقبال کی پیکر تراشی کی عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں ان میں سے ایک نظم "مسجد قرطبہ" ہے۔

غنائیت شعر کی روح ہے۔ اس کے بغیر شاعری بے کیف ہے۔ ہر بڑا شاعر اس راز کو جانتا ہے اور اقبال تو نہ صرف اس راز کو جانتے تھے بلکہ موسیقی میں درک بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے ستار بجانے کی خاصی مشق بہم پہنچائی تھی۔ موسیقی میں مہارت کا استعمال اقبال نے بڑے سلیقے کے ساتھ کیا۔ ہر نظم کے ترنم کا انتخاب کرتے وقت موضوع سے اس کی مناسبت کا وہ خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ "مسجد قرطبہ" کا ترنم بوجھل اور آہستہ خرام ہے۔ پڑھنے والے کے ہونٹوں سے مصرعے پھسلتے نہیں، رک رک کر نکلتے ہیں۔ یہ خیال درست ہے اور یہ خصوصیت شاعر کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے اور یہی موضوع کا تقاضا ہے۔ یہ ایک عظیم مسجد کا احوال ہے جس کی عمارت بھاری بھرکم پتھروں سے دھیرے دھیرے اٹھی ہوگی۔ نظم کے صوتی آہنگ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے۔

نظم کی بحر کا انتخاب بھی شاعر نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس بحر کا رواج اردو شاعری میں نسبتاً کم ہے کیونکہ اس میں زیادہ روانی نہیں ہے۔ یہ ہے بحرِ مسرح زحافی آٹھ رکنی یعنی مفتعلن فاعلن، مفتعلن فاعلن۔

Scanned with CamScanner

ایک خاص بات یہ کہ جس طرح یہ بحر دو حصوں میں تقسیم ہے اسی طرح نظم کے بیشتر مصرعے بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں مثلاً ____

سلسلۂ روز و شب ــ نقش گرِ حادثات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ ــ مجھ کو پرکھتا ہے یہ

تو ہو اگر کم عیار ــ میں ہوں اگر کم عیار

داخلی قوافی کے استعمال سے بھی شاعر نے جابجا ترنم کا ایک نظام قائم کیا ہے جیسے۔

شوق مری لے میں ہے ، شوق مری نے میں ہے

دل میں صلوٰۃ و درود ، لب پہ صلوٰۃ و درود

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

نظم میں شاعر نے کہیں کہیں ترصیع بندی کا بھی اہتمام کیا ہے مثلاً اسی شعر میں۔

آبِ روانِ کبیر، تیرے کنارے کوئی دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب

ماہرینِ اسلوبیات نے نشان دہی کی ہے کہ اقبال کے یہاں خاص طور پر اس نظم میں افعال کا استعمال بہت کم اور اسما کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ گویا "ان کے یہاں اسمیت کا وفور ہے جس سے جلال و طنطنے، حرکت و حرارت، قوت و شوکت اور ولولۂ حیات کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے"۔ اس نظم کا پہلا بند "سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات" اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظم میں صفیری و مسلسل آوازیں ۹۳۱ بار اور ہکار و معکوس آوازیں صرف ۲۹ بار استعمال ہوئی ہیں۔

اس نظم کے لیے اقبال ایک مشکل ساخت کا انتخاب کرتے ہیں۔ نظم میں آٹھ بند اور ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ ہر بند کے سات سات اشعار ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ گویا یہ نظم آٹھ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے باوجود یہ نظم تسلسلِ خیال کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں غزل اور نظم کی خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔

اس نظم کا مرکزی نقطہ دراصل ایک خواب ہے۔ اسلام کی سرفرازی کا خواب جسے اقبال نے فکر، جذبہ اور تخیل کے امتزاج سے تراشا ہے۔ بے شک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا لیکن اس لافانی نظم کے سانچے میں ڈھل کر شاعر کا یہ خواب اردو شاعری کی تاریخ میں امر ضرور ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

Scanned with CamScanner

یادیں

یادیں اختر الایمان کی اہم ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ آدمی زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے ضمیر سے جس طرح سمجھوتا کرتا ہے، اس نظم میں زندگی کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختر الایمان کی شاعری میں اقدار کی شکست اور ابتری کا احساس بہت شدید ہے۔ کہیں اس احساس نے برہمی کی شکل اختیار کی ہے کہیں ملال کی۔ ان کی متعدد نظموں میں اس تجربے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں میں مسلسل تصادم اور پیکار ہوتی رہتی ہے اس سے خود کو بچانے کے لیے انسان اگر مفاہمت نہ کرے تو کیا کرے۔ جس معاشرے میں وہ سانس لے رہا ہے اسے بقول اختر الایمان آئیڈیل نہیں کہا جا سکتا لیکن روٹی کمانی ہے تو مفاہمت کرنی ہی پڑے گی۔ 'سروساماں' کے پیش لفظ میں اختر الایمان نے لکھا ہے:

> ''گزران'' کا ایک لفظ میرے ذہن میں ہے جو میں سمجھتا ہوں پوری زندگی کی اساس ہے۔ آدمی جہاں بھی ہے خواہی نہ خواہی گفتنی ناگفتنی ہر طرح کے قیود و بند میں رہ کر گزران کرتا ہے۔ یہ گزران کوئی سوچا سمجھا ہوا فعل نہیں ایک افتاد ہے جیسی پڑتی ہے جھیلتا اوٹتا ہے''[11]

اختر الایمان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف اس کی ڈرامائی کیفیت یا اس کا افسانوی انداز ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی نظموں میں کئی اہم کردار تخلیق کیے ہیں۔ اس نظم میں بھی اختر الایمان نے کردار کے ذریعہ زندگی کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی ہے۔ نظم ''ایک لڑکا'' اور ''یادیں'' میں مماثلت کے بعض پہلو تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً دونوں نظموں میں دو کردار

Scanned with CamScanner

ہیں ایک لڑکا اور دوسرا بالغ کردار۔ دوسرے ہر بند کے ایک ہی مصرعے کی تکرار دونوں نظموں میں ضمیر اور سماج کی کشمکش ہے لیکن اس کے باوجود دونوں نظموں کی فضا اور اثر انگیزی میں بڑا فرق ہے۔ نظم ایک لڑکا میں 'لڑکے' کا کردار غالب ہے۔ اس کی تازگی اور توانائی قائم ہی نہیں رہی بالآخر وہ بالغ کردار پر غالب بھی آجاتا ہے۔ جبکہ یادیں میں ''بالک'' کا کردار تھوڑی دیر کے بعد دنیا کے میلے میں کھو جاتا ہے۔ اس نظم کا آغاز ہی افسردگی اور اضمحلال کی فضا سے ہوتا ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

لو وہ چاہِ شب سے نکلا پچھلے پہر پیلا مہتاب
ذہن نے کھولی رکتے رکتے ماضی کی پارینہ کتاب
یادوں کے بے معنی دفتر، خوابوں کے افسردہ شہاب
سب کے سب خاموش زباں سے کہتے ہیں اے خانہ خراب
گزری بات صدی یا پل ہو گزری بات ہے نقش برآب
یہ روداد ہے اپنے سفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

۱۳ بند کی اس نظم میں ''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں'' کو ہر بند کے آخر میں دہرایا گیا ہے۔ یہ نظم اخترالایمان کے تجربات و مشاہدات کی بہت اچھی مثال کہی جاسکتی ہے۔ آج کے اس سماج میں آدمی کیسے زندگی بسر کرتا ہے اس کی کہانی اس نظم میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ اس نظم میں ''بالک'' ضمیر کی علامت ہے۔ میلہ، زندگی کا میلہ ہے۔ رنگ برنگے کھلونے آرزوئیں اور تمنائیں ہیں۔ باپ اعلیٰ اور برتر اقدار ہیں۔ چار دہائی پہلے لکھی گئی اس نظم کی معنویت آج اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت اور اخلاقی زوال جتنا آج کے سماج میں ہے پہلے کبھی نہیں تھا۔ ہر شخص بکنے کو تیار ہے خریدار کی بھی کمی نہیں اور بکنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ بددیانتی، لوٹ مار، مکر و فریب کا بازار گرم ہے، خوشامد پرستی ہر شخص کا شیوہ بن چکا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آچکا ہے جس میں تمام غیر اخلاقی چیزیں روا ہیں۔ ایسے معاشرے میں روٹی کمانے کے لیے وہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو اس سماج کا

Scanned with CamScanner

دستور بن چکا ہے۔ ایسی صورت میں سماج کے درمیان توازن قائم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آدمی قدم قدم پر مفاہمت نہیں کر پاتا کہ ابھی اس کا ضمیر زندہ ہے۔ چنانچہ ایک کش مکش اور تذبذب کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اخترالایمان کی شاعری میں یہی کشمکش اور تذبذب کی صورت حال غالب عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اخترالایمان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیر اور سماج کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش اور اس دوران کی کشمکش سے ان کی شاعری کا گہرا سروکار ہے۔ اس نظم کے تیسرے بند تک بالک (ضمیر) کے وجود کا احساس ہوتا ہے اور اس کی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بالغ کردار بالک کے کردار سے الگ ہوجانا ہے اور اپنے ضمیر کے خلاف سمجھوتا کرلیتا ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجیے:

وہ بالک ہے آج بھی حیراں میلہ جوں کا توں ہے لگا
حیراں ہے بازار میں چپ چپ کیا کیا بکتا ہے سودا
کہیں شرافت کہیں نجابت کہیں محبت کہیں وفا
آل اولاد کہیں بکتی ہے کہیں بزرگ اور کہیں خدا
ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا
اور نکالی راہ مفر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

شرافت، نجابت، محبت، آل اولاد، بزرگ اور خدا کو بکتے دیکھ کر بالک حیران ہے۔ انسانی اور اخلاقی اقدار کی عبرت ناک صورت حال دیکھ کر وہ کشمکش اور تذبذب میں مبتلا ہے۔ بالک لکشمن کے عام آدمی کی طرح حیرت زدہ ہوکر دیکھ رہا ہے لیکن کچھ کہتا نہیں۔ اس نیلام گھر میں آدمی کا ضمیر قدم قدم پر ساتھ نہیں دے پاتا۔ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دباتا جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام تر جذبات و احساسات اور خوابوں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ کر اپنے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ لیکن بالک ایسا نہیں کرتا۔ چنانچہ وہ گہرے طنز کا نشانہ بنتا ہے۔ ''ہم نے اس احمق کو آخر اسی تذبذب میں چھوڑا'' سے ایک اندوہ ناک طنز کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تیسرے بند کے

Scanned with CamScanner

بعد بالک (ضمیر) بالغ کردار سے جدا ہوجاتا یا یوں کہا جائے کہ دنیا کے میلے میں اسے تذبذب کے عالم میں چھوڑ کر بالغ کردار مفاہمت کی راہیں اختیار کرلیتا ہے۔ خود وہ شخص اس کا انکشاف کرلیتا ہے اس نے بالک کو چھوڑ کر یہ راہیں اختیار کرلی ہیں۔ زندگی سے مفاہمت کرنے والا شخص جن نشیب و فراز اور سرد و گرم سے گزرتا ہے اس کی روداد وہ خود بیان کرتا ہے۔ آگے نظم کے کئی بند میں دنیا داری کے سفر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

ہونٹ تبسم کے عادی ہیں ورنہ روح میں زہر آگیں
گھپے ہوئے ہیں اتنے نشتر جن کی کوئی تعداد نہیں
کتنی بار ہوئی ہے ہم پر تنگ یہ پھیلی ہوئی زمیں
جن پر ناز ہے ہم کو اتنا جھکی ہے اکثر وہی جبیں
کبھی کوئی سفلہ ہے آقا کبھی کوئی ابلہ فرزیں
بیچی لاج بھی اپنے ہنر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

کبھی غنیم جور و ستم کے ہاتھوں کھائی ایسی مات
ارض الم میں خوار ہوئے ہم بگڑے رہے برسوں حالات
اور کبھی جب دن نکلا تو بیت گئے جگ ہوئی نہ رات
ہر سو مہوش سادہ قاتل لطف و عنایت کی سوغات
شبنم ایسی ٹھنڈی نگاہیں پھولوں کی مہکار سی بات
جوں توں یہ منزل بھی سر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

بالغ کردار بالک کا ساتھ چھوڑ کر کیسے گزران کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ان مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ بالغ کردار آج کے سماج کا کوئی بھی آدمی ہوسکتا ہے۔ جو زندگی بسر کرنے کے لیے قدم قدم پر مفاہمت کرنے کے لیے مجبور ہے۔ کبھی خوشامد کرتا ہے، کبھی جھوٹی تعریفیں

Scanned with CamScanner

کرتا ہے، کبھی دوسروں کے سامنے سر جھکاتا ہے کبھی اپنے فن کا سودا کرتا ہے۔ کبھی دوسروں کے ہاتھوں مات کھاتا ہے۔ کبھی اپنی ہوشیاری سے دوسرں کی چالوں کو مات دیتا ہے۔ کبھی سر جھکا کر ذلت سہتا ہے۔ کبھی حسن و عشق سے سرشار ہوتا ہے، کبھی محبت کے کھنڈر سے گزرتا ہے۔ کبھی ٹھنڈی نگاہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، کبھی جدائی کے غم میں تڑپتا ہے۔ زندگی کی دشوار گزار راہوں میں اسے اپنے خواب بھی یاد آتے ہیں۔ لیکن اس کے خواب ایک سرے پر ہیں دوسرے سرے پر اس کی حقیقی زندگی ہے۔ دونوں میں اتنا فاصلہ ہے کہ اسے طے کرنا شاید ممکن نہیں۔ اپنے سینے میں حسین زندگی کا خواب سجائے ذلت آمیز زندگی بسر کرتا ہے۔ یہاں اہم پہلو یہ ہے کہ وہ بالک (ضمیر) کا ساتھ چھوڑ کر مطمئن نہیں اس کو ایک خلش کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ'' دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں'' اپنی محرومیوں اور ذلت پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔ تمام اخلاقی ذمہ داریوں سے نظریں چرانے کے باوجود اسے اس کا احساس باقی ہے صرف اپنی زندگی جینے پر بار بار اصرار کے باوجود سماجی ذمہ داری کا احساس باقی ہے:

زیست خدا جانے ہے کیا شے بھوک تجسس اشک فرار
پھول سے بچے زہرہ جبینیں مرد مجسم باغ و بہار
مرجھا جاتے ہیں اکثر کیوں کون ہے وہ جس نے بیمار
کیا ہے روح ارض کو آخر اور یہ زہریلے افکار
کس مٹی سے اگتے ہیں سب جینا کیوں ہے اک بیگار
ان باتوں سے قطع نظر کی اس آباد خرابے میں
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

انکار کے باوجود یہاں یہ پہلو اہم ہے کہ اس کی نظر زندگی کے بنیادی مسائل اور معاشرتی ناہمواریوں پر بہت گہری ہے۔ فرار کے باوجود وہ شخص ان مسائل کو نظر انداز نہیں کر پاتا۔ جیسا کہ اخترالایمان کی نظموں میں فطرت کے خوبصورت مناظر، گاؤں اور دیہاتوں کی سیدھی سادی اور معصوم زندگی کو ایک پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اس نظم میں اس

Scanned with CamScanner

کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے:

دور کہیں وہ کوئل کوکی رات کے سناٹے میں دور
کچی زمیں پر بکھرا ہوگا مہکا مہکا آم کا بور
بار مشقت کم کرنے کو کھلیانوں میں کام سے چور
کم سن لڑکے گاتے ہوں گے لو دیکھو وہ صبح کا نور

یوں لگتا ہے کہ اسے معصومیت اور سیدھی سادی زندگی چھن جانے کا غم کچوکے لگا رہا ہے۔ گزری باتوں سے قطع نظر کرکے مستقبل کے بارے میں سوچ کی تلقین کے ساتھ نظم ختم ہوتی ہے۔ اس پوری نظم کو سامنے رکھا جائے تو عہد حاضر میں ایک فرد کی پوری زندگی سامنے آجاتی ہے۔ اس کے خواب شکست خواب، اس کی تمنائیں، آرزوئیں، اس کی ناکامی ومحرومی اس کی محبت اور ناکامی غرض کہ سب کچھ سامنے آجاتے ہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ نظم زندگی بسر کرنے کے لیے حالات کے ساتھ مفاہمت کرنے والے شخص کی کہانی ہے۔ اس کے تمام درد وکرب کو بڑے سلیقے سے اس نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کو اختر الایمان کی اہم ترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

○■○

Scanned with CamScanner